خوابوں کے رنگ

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-000-0

کتاب	:	کہانیاں اپنی
مصنفہ	:	سلمٰی اعوان
موسم اشاعت	:	2011
مطبع	:	ورڈمیٹ، اسلام آباد
قیمت	:	000.00روپے

دوست پبلی کیشنز: پلاٹ 110، سٹریٹ 15، 9/2-I، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد
فون: 051-4102784-85 E-mail: dostpub@nayatel.pk

ابّا کے نام

میرے ابّا کیسے تھے؟ یونانیوں جیسے۔ پر پولیو نے داغ لگا دیا تھا۔ چال پر بھی اور قامت پر بھی۔ کبھی کبھار جو ہنستے محسوس ہوتا جیسے چہرے پر گلاب کا کھیت اُگ آیا ہے۔ پر جونہی بولتے، سُولوں کے نوکیلے سروں کے چُبھنے کا گمان گذرتا۔ جس دن اُنہیں دُنیا سے جانا تھا، اپنی واکنگ سٹک سے میری ٹانگوں کی تواضع کی کہ میں اسپتال کے کوریڈور میں اُن سے تیز کیوں چلتی ہوں؟ ٹسٹوں اور ایکس رے کے بعد اپنے بیڈ پر آ کر اُنہوں نے غصیلے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے اپنی خالی کلائی کی طرف اشارہ کیا اور جب میں اُنہیں گھڑی پہناتی تھی اُنہوں نے آنکھیں بند کی تھیں اور پھر وہ آنکھیں میری کسی اوٹ پٹانگ حرکت پر غُصّے کی اظہار کے لئے نہیں کُھلی تھیں۔

ترتیب

زندگی کیسا تیرا چلن

گئے دنوں کی بات ہے۔ یہی پینتیس چالیس سال پہلے جب زمانے کو ابھی اتنے پر نہیں لگے تھے۔ پرنٹ میڈیا نے بھی خوبصورتی کو گلیمرس کرنا نہیں سیکھا تھا۔ کوٹھوں اور چوباروں کے زینے نہیں چڑھا تھا، الیکٹرونک میڈیا تو ابھی دودھ پیتا رالیں ٹپکاتا بچہ تھا۔ ایسے میں حُسن کو خراج پیش کرنے اور خوبصورتیوں کے موازنوں اور مماثلتوں کے لیے صرف محاوروں اور پڑھی ہوئی چیزوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

ہم نچلے متوسط طبقے کی عام سے خدوخال والی لڑکیاں تو اُسکے انتہا درجے کے فسوں خیز حُسن کو پہلی بار دیکھ کر بھونچکی رہ گئیں۔ پلکیں جھپکنا تو درکنار چند لمحوں کے لیے تو سانس لینا بھی بھول گئیں۔ سچی بات ہے کیا شے تھی وہ۔ ہاتھوں کانوں سے ننگی بُچی تھی۔ ہونٹوں گالوں پر ذرا سی لیپا پوتی نہیں تھی۔ پر وہ جو کہتے ہیں کہ حُسن تو خود ایک فتنہ پرور شے ہے۔ بناؤ سنگھار کے نام جھام نہ بھی ساتھ ہوں تو بھی اکیلا ہی کافی ہوتا ہے۔

پہلی ملاقات بس سٹاپ پر ہوئی تھی۔ کالج میں سارا وقت وقفے وقفے سے بجلی کا کوندا سا لپک کر آنکھوں کے سامنے لہراتا رہا۔ دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ لٹریچر کی کلاس میں پرڈیٹا The Winter's Tale کے صفحوں سے نکل کر سامنے آ گئی اور اُسکے چہرے سے اپنا چہرہ لگا کر بولی تھی۔

''لو دیکھو تو ذرا مجھے بھی۔''

''چلو ہٹو۔اندر جیسے بھنا کر بولا تھا۔کہاں تمہارا معصوم سا دیہاتی حُسن اور کہاں وہ لشکارے مارتی بجلی۔''

ٹکراؤ ہر روز بس سٹاپ پر ہوتا۔جونہی وہ بصارت کی زد میں آتی میری آنکھوں میں جیسے ایکسرے مشین فٹ ہو جاتی۔سر سے لے کر پاؤں تک کا جائزہ۔سنہرے خشک بک میں بھر جانے والی لانبے بالوں کی چوٹی جیسے بین کی دُھن پر رقصاں کسی مست ناگن کیطرح اُسکی کمر پر لہرا رہی ہوتی۔مخروطی انگلیوں والے اُسکے دودھیا ہاتھ تو مجھے رانی جنداں کے ہاتھوں جیسے لگتے۔بڑی گھمنڈی تھی۔خود بینی و خود آرائی کی سان پر چڑھی ہوئی۔مجال تھی کہ آنکھوں کے زاویوں کا رُخ کبھی کسی چہرے کی طرف کر لیتی۔گداز گلابی ہونٹ ایک دوسرے سے چپکائے نظریں اسی سمت جمائے رکھتی جدھر سے بس متوقع ہوتی۔میں بھی کسی گھائل ہوئے عاشق کیطرح ایسی جگہ بیٹھنے کو ترجیح دیتی جہاں اُسکے نظارے میں سہولت ہو۔

جب من کو بھانے کا عمل ایسا زور دار ہو تو پھر جان کاری کے لیے جان پر ہی بن آتی ہے۔کھوج کاری کی تو نام ذکیہ طور پتہ چلا۔بی۔ایس سی لائل پور کے کسی کالج سے کی تھی اور اب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ایس سی کی سٹوڈنٹ تھی۔گھر میرے راستے میں تھا۔ بیچارہ ٹوٹا پھوٹا،واویلا کرتا اور مکینوں کا پول کھولتا ہوا۔

'چچ چچ' یہ ہیلن آف ٹرائے تو ہماری طرح غریبڑی سی ہے۔دل تو جیسے بلیوں اُچھلا تھا پر یقین نہیں آ رہا تھا۔سب جھوٹ لگ رہا تھا۔شاید اسی لیے زبان سے بھی نکل گیا۔

''یار جمیلہ اب سین میں کلائمکس تو پیدا نہ کرو۔معلومات کے اس منبع یعنی میری کلاس فیلو جمیلہ رزاق نے بہت بُرا منایا۔''

''تف ہے تم پر۔گھر آ جانا لے چلوں گی تمہیں اسکے ہاں۔جانا نہ چاہو تو چھت

کے بیر ے سے دیدار کروا دوں گی ۔''

جمیلہ ایک اور اطلاع کی بھی راوی تھی کہ وہ اپنی پھوپھی کے بیٹے سے منسوب ہے اور اس کا منگیتر لندن میں ہے ۔لندن کا سُن کر میں نے سوچا ۔

''ارے یہ لندن چلی جائے گی ۔اس کا حُسن تو وہاں کی سرد ہواؤں میں اور قیامت بن جائے گا۔''

ہاں تو چلیے اب اس کہانی کے دوسرے رُخ پر۔

اُس دن چھٹی ہی تھی جب میرے والد نے میری اماں سے کہا۔

''اُٹھو اور میرے لیے چائے پراٹھا بنا دو۔ میں نے ڈاکٹر محمود کے ہاں کام کے لیے جانا ہے۔''

اماں ہفتے کے چھ دن نور پیر کے سمے اُٹھنے کی عادی تھیں ۔ساتویں دن وہ تھوڑی سی عیاشی کے موڈ میں ہوتیں ۔تنک کر بولیں ۔

''کبھی چھٹی کے دن گھر پر بھی ٹک جایا کرو ۔اب سارا دن وہاں گُل کر کے آؤ گے۔''

''میرا جانا تمہارے دیدوں میں کیوں چُبھنے لگا ہے؟ دوائی کے پیسے دیتے ہوئے تو تمہاری جان نکلنے لگتی ہے۔'' ابا کا لہجہ اماں سے بھی زیادہ کھردرا اور کڑوا تھا۔

رات کو جب ابا آئے اور باورچی خانے میں ہمارے پاس بیٹھے تو اماں سے مخاطب ہوئے ۔

''بھئی ڈاکٹر کی بیوی کوئی حسین ہے یقین کرو میں نے ایسی شاندار اور خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی ۔''

چولہے میں جلتی لکڑیوں کی زرد روشنی میں مجھے ابا کی آنکھیں اور انکے چہرے پر

پھیلے تاثرات سب حُسن کے سحر میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے۔

اماں نے روٹیاں پکالی تھیں۔توے کو اُٹھا کر دیوار سے لٹکایا تو اسکی پشت پر ٹمٹماتی ننھی ننھی چنگاریوں کا ایک بڑا سا دائرہ یوں نظر آیا جیسے کسی نے لو دینے والے موتیوں کو کسی بڑے سے تھال میں چُن دیا ہو۔

ابا نے ڈاکٹر کی بیوی کے حسین ہونے کا ذکر کیا تو دھیرے دھیرے بُجھتے اُن چنگاریوں کے دائرے پر مجھے ذکیہ طور کا چہرہ نظر آیا۔اندر سے سوال ہوا تھا۔

اُس ذکیہ طور سے بھی زیادہ۔

گھر میں وائرنگ کی تاریں لگانا تھیں۔ مجھے اس نے سب کمرے دکھائے۔ ہدایات دیں اور کہا۔

''دیکھو مستری کام بہت عمدہ ہونا چاہیے۔پیسوں کی فکر مت کرنا۔ہاں کھوناشتہ واشتہ کرو گے؟''

میں نے کہا۔

''جی ناشتہ تو کر چکا ہوں البتہ چائے پیوں گا اور کام کی تسلی رکھیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے اور ڈاکٹر صاحب ہمارے مہربان ہیں۔''

کیا بتاؤں کلثوم جب وہ چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے کسی جھیل کے نیلے پانیوں پر ہنس راج تمکنت سے تیرتا ہو۔بات کرتی تھی تو کانوں میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے۔

اماں ابا کی ایسی شاعرانہ باتوں پر مارے اشتیاق کے بولیں۔

''سچی ایسی ہے تو مجھے بھی دکھانا''

''لے چلوں گا تمہیں بھی کسی دن۔اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا''

اور واقعی ایک دن اماں بھی ابا کے ساتھ سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر اس کے دیدار کو

چلی گئیں۔ جب واپسی ہوئی تو حُسن کے قصیدے بھی زبان پر تھے۔ دریا دلی کے قصے بھی اور حُسن اخلاق کی باتیں بھی۔

''قربان جاؤں اس پیدا کرنے والے کے۔ جب کہیں فرصت ملی ہوگی نا تو اس وقت بنایا ہوگا۔ ارے صورت تو اللہ کی دین ہے پر اسکا تو اخلاق بھی ایسا کہ بندے کے کلیجے میں ہی اُتر جائے۔ اور جو بات کرے تو لگے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔ اور دل۔

''ارے اتنا بڑا'' اماں نے ہاتھوں کو یوں پھیلایا جیسے اسکے دل کی پیمائش ہی تو کر کے آئی ہوں۔ پہلے تو مٹھائی اور بسکٹ کھلائے پھر چائے پلائی۔ اور یہ تم بچوں کے لیے زبردستی ساتھ کیا۔ اماں نے تھیلے میں سے ڈھیر سارا پھل کنالی میں لڑھکاتے ہوئے کہا۔

''ارے'' اماں پھر بولیں۔

''ڈاکٹر بھی گبھرو جوان ہے۔ نقش بھی سوہنے اور رنگ بھی کھلتا ہے۔ جوڑی تو جیسے چاند سورج کی ہے۔''

اماں کے ساتھ ابا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ڈاکٹر کے دو بچے تھے۔ بیٹا اور بیٹی۔ ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر کی ظاہری پُر کشش شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی کچھ داخلی خوبیوں نے قرب و جوار کے پورے علاقے میں اُسے معروف و مقبول بنا رکھا تھا۔ نرم خو اور ہمدرد جس کے کلینک اور ملحقہ اسپتال کے برآمدوں میں مُفتوں کی بھی لام ڈور موجود ہوتی۔ ڈاکٹروں کے خاندان سے تھا۔ تینوں بڑے بھائی اور انکے بیٹے سب اس مقدس پیشے کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔

پھر ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ یہ گلابی سے جاڑوں کے دن تھے۔ میں پڑھتے پڑھتے سر شام ہی سو گئی تھی۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا جب اچانک میرے آنکھ کھل گئی۔ بتی

بند تھی پر اماں ابا کی آوازیں قدرے اونچی سرگوشیوں میں جاری تھیں۔ ذکر ڈاکٹر کا تھا۔ کمرے میں کینن ڈائل کی کہانیوں جیسا اسرار پھیلا ہوا تھا۔ میری آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں اور کان چوکس ہو کر اُن سرگوشیوں کو سُننے لگے تھے۔

ابا کا لہجہ عجیب سا محسوس ہوا تھا جب وہ بول رہے تھے۔

''کل اس نے مجھے اپنے کلینک پر بلوایا اور کہا کہ تم نے گھر جانا ہے بیڈ روم میں تھوڑا سا کام کرنا ہے۔''

''جناب میں اتوار کو ہی جا سکوں گا۔''

میں نے قدرے تذبذب سے کہا۔ کیونکہ مجھے گاؤں بھی جانا تھا۔ پر ڈاکٹر نے فوراً میری بات کاٹ دی۔

''ارے نہیں بھئی بیگم کی زبردست تاکید ہے۔ کام نہیں ہوا تو مجھ پر چڑھائی ہو جائے گی۔''

اب ایسے بیبے بندے کو مزید انکار تو مشکل تھا نا۔ میں ہنس پڑا ''چلیے ٹھیک ہے تو پھر ایک دو دن میں کام ہو جائے گا مگر میں تین بجے کے بعد ہی جا سکوں گا۔''

آج جب میں وہاں پہنچا۔ شام کے سائے تو ڈھل گئے تھے پر دیواروں اور درختوں پر دھوپ کے رنگ ابھی براجمان تھے۔ کوٹھی کا آہنی گیٹ بند تھا۔ پر چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ میں اور میری سائیکل کا داخلہ اسی راستے سے ہوا۔ پر اندر آ کر مجھے باغ اور گھر پر عجیب سی ویرانی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ کوئی انسانی یا حیوانی آواز کوئی شکل کچھ بھی سنائی یا دکھائی نہ دیا۔ برآمدے میں ہونقوں کی طرح کھڑا اُلجھن میں گھرا کیا کروں اور کیا نہ جیسے احساسات میں اُلجھا تھوڑی دیر اس صورت حال پر کُڑھتا اور اپنے آپ سے یہ کہتا ہوا کہ بھئی اب مجھے اپنے پھیرے کو ضائع تو نہیں کرنا اور بیڈ روم جس میں مجھے کام کرنا ہے کا پتہ ہے۔ لہٰذا چل کر

کام کرتا ہوں۔ پر قدم اُٹھانے سے پہلے مجھے یاد آیا کہ چلو بیل بجا کر دیکھتا ہوں۔ میں گیٹ کی طرف ہولیا۔

گھنٹی پر ہاتھ رکھا تو وہ شاید خراب تھی۔ اب اندر جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میں چلتے چلتے پچھلے برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ بیڈروم کے ساتھ باتھ روم تھا جس کا دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ میں نے اِسی سے اندر جانے کا سوچا کیونکہ وہ میرے قریب تھا۔ دروازے کو دھکا دیا۔ وہ کھلا تھا۔ میں باتھ روم میں داخل ہوا اور بیڈروم کا دروازہ کنڈی سے پکڑ کر کھینچا۔ دروازہ کھل گیا پر میرے سامنے جو منظر تھا وہ۔۔۔۔۔''

اس اندھیری رات میں میں پوری طرح ہوش وحواس میں آ چکی تھی میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ مجھے لگا جیسے کہیں کلاک میرے سینے میں فٹ ہو گیا ہے۔

اماں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ''کیا دیکھا تم نے؟''

''ارے کیا بتاؤں کیا دیکھا؟'' ابا خاموش تھے اور اماں کی بے کلی عروج پر تھی۔

''بتاتے کیوں نہیں؟''

''اری ڈاکٹر کی بیوی کسی مرد کے ساتھ ہم آغوش تھی۔''

''تو نے ڈھنگ سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کیا معلوم وہ ڈاکٹر ہی ہو۔''

''لو اور سنو! وہ تو اپنے کلینک پر بیٹھا تھا۔ میں جاتے ہوئے اُسے بتا کر گیا تھا۔''

اور اماں نے تو بہ استغفار کا ورد شروع کر دیا۔

''بھاگوان میری تو ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگی تھیں۔ پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ سانس جیسے لوہار کی دھونکنی کیطرح چلنے لگا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے جیسے دروازہ کھولا تھا ویسے ہی بند کیا اور باہر آ گیا۔ گیٹ کے پاس سے سائیکل اُٹھائی اُس پر چڑھا پر جب پیڈلوں پر پاؤں پڑے تو مجھے یوں لگا جیسے ان میں جان نہ ہو۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ

اس کریہہ منظر کے متعلق کیا کروں؟ ڈاکٹر کو بتاؤں یا خاموش رہوں۔

پہلے میں نے سوچا کہ یہ بڑے لوگوں کا معاملہ ہے مجھے اس میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو صریحاً دھوکہ ہے کسی خیر خواہ کے گھر نقب لگ جائے۔ چور بند دروازے توڑ کر اندر گھس آئیں۔ یکین نمک حرامی پر اُتر آئیں اور غداری کر دیں تو مالک کو خبر تو کرنی چاہیے۔ یہی سوچتے ہوئے میری سائیکل کا رُخ ڈاکٹر کے کلینک کی طرف مُڑ گیا۔ ڈاکٹر مریضوں کے ساتھ مصروف تھا۔ میں اندر گیا میرا چہرہ یقیناً زرد ہو گا۔ میرے ہونٹ یقیناً سفید ہوں گے۔ میری آنکھوں میں خوف کے سائے ہوں گے۔ کیونکہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔''

''کیا بات ہے خیریت تو ہے؟''

اور میں نے کہا ''جناب بات تنہائی میں کرنے کی ہے''

ڈاکٹر فوراً اُٹھ کر پچھلے کمرے میں آیا۔ میں نے ساری بات اُسے بتا دی۔ اُسی لمحے وہ کار میں بیٹھا اور گھر چلا گیا۔ میں اپنے گھر آ گیا۔ اب پتہ نہیں اُس نے وہاں کچھ دیکھا یا نہیں۔

ابا کی اس گفتگو نے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح مجھے رات بھر جگائے رکھا۔ پتہ نہیں کب صبح کے قریب میری آنکھ لگی پر آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلی بات رات والی کہانی تھی۔

یقیناً ڈاکٹر نے وہی منظر دیکھ لیا ہو گا کیونکہ چند دنوں بعد سننے میں آیا کہ ڈاکٹر سخت پریشان ہے۔ کلینک کے اوپر کمروں میں رہنے لگا ہے۔ گھر نہیں جاتا۔ میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی ہے۔ بیوی طلاق مانگتی ہے۔ پھر کچھ ماہ بعد سننے میں آیا کہ ڈاکٹر نے طلاق بھی دے دی ہے اور بچے بھی۔

عورت کے متعلق بڑی مشہور سی روایت ہے کہ وہ پیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہے مگر

ہماری اماں کا ہاضمہ بڑا زبردست نکلا۔ کسی کڑوے کسیلے گھونٹ کیطرح وہ اس واقعے کو پی گئی تھیں۔ ہماری نانی ڈاکٹر کے مستقل زیر علاج تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن کلینک جاتی رہتی تھیں۔ پر مجال ہے جو اماں نے ذراسی بھنک بھی ان کے کانوں میں ڈالی۔ ڈاکٹر کی ناکام ازدواجی زندگی کے متعلق وہ باتیں اور کہانیاں سُنتی اور لبوں کو سیئے بیٹھی رہتیں۔

اب مثلث کا تیسرا زاویہ بنتا ہے یوں کہ ہمیں سخت قسم کا تپ چڑھ آیا۔ دو تین دن تک کوئی نوٹس نہ لیا گیا پر چوتھے دن جب ہماری حالت خاصی خراب تھی۔ اماں نے کہا۔

''اب تمہارا اباوا تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ وہ تو جانے کب لوٹے تم خود ہی ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ نا۔ اپنے باپ کا نام بتا دینا وہ دوا دے دے گا۔''

مجھے اس بات پر سخت غصہ آیا۔ تنک کر میں نے کہا۔

''اماں کمال کرتی ہیں کبھی بیمار آدمی بھی اکیلا ڈاکٹر کے پاس گیا ہے ساتھ ایک آدمی تو ہونا چاہیے۔ یوں بھی مجھے تو چکر آتے ہیں۔ کہیں گر گئی تو اور مصیبت پڑ جائے گی۔''

''توبہ اللہ کتنی تھڑ دلی ہو تم۔ ذرا سا بخار چڑھا اور جی ہار کر بیٹھ گئیں۔ کالج پڑھنے بھی تو جاتی ہو۔ دو قدم پر ڈاکٹر کے کلینک نہیں جا سکتی ہو۔''

اماں سے بحث کرنا قطعی بیکار تھا۔ چھوٹے موٹے بخار یا بیماری کو تو وہ کبھی لفٹ نہیں کراتی تھیں۔

چنانچہ میں نے حوصلہ کیا اور کلینک پہنچ گئی۔ برآمدوں اور کمروں میں مریضوں کا ایک اژدہام تھا۔ مگر کوئی مریض ڈاکٹر کے کمرے میں نہیں جا رہا تھا۔ گرمیوں کے دن اور لوگوں کا ہجوم۔ بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ دیر بعد میں نے کمپونڈر سے پوچھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر بیٹھے ہیں یا نہیں؟''

''بی بی ڈاکٹر صاحب کسی مریض سے بات کر رہے ہیں۔''

''اچھا!'' میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے پھر بیٹھ گئی۔تقریباً آدھ گھنٹہ پھر گزر گیا اور مریضوں کا ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہونا اور نکلنا شروع نہ ہوا تو میں نے ہمت کی اور ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

میرے اللہ! کیسا رومان پرور سا خنکی سے لبالب بھرا ہوا خواب ناک سا ماحول تھا۔اندر ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ان دنوں ائیر کنڈیشنر خال خال کسی آدمی کے پاس ہوتا تھا۔ہم جیسے ماڑے موٹوں کو تو اس کا علم بھی نہیں تھا۔کمرے کی دیواریں ہلکی نیلی اور پردے گہرے نیلے تھے۔ریڈیو مدھم سروں میں فلمی گیت الاپ رہا تھا۔ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا چہرے پر اشتیاق و شوق کی دُنیا بکھیرے سامنے دیکھ رہا تھا اور اس کے سامنے کون تھا؟

سامنے صوفے پر ذکیہ طور تھی دوسری طرف کرسی پر جمیلہ رزاق کی بڑی بہن ہاتھ میں کوئی رسالہ پکڑے بیٹھی تھی۔ذکیہ طور نے میری طرف دیکھا۔مدھ بھری شربتی آنکھوں میں برہمی کے آثار تھے۔میں ان کی تنہائی میں مخل جو ہوئی تھی۔ڈاکٹر کی نگاہوں میں بھی کچھ ایسے ہی احساسات مجھے محسوس ہوئے تھے۔

میں نے فوراً کہا۔''ڈاکٹر صاحب میں مستری محمد علی کی بیٹی ہوں اور مجھے بہت سخت بخار ہے''

ابا کا نام سنتے ہی اس نے فوراً کہا۔ ''آؤ آؤ یہاں بیٹھو۔'' میں سٹول پر بیٹھ گئی۔اور جب ڈاکٹر مجھے چیک کر رہا تھا میری نظریں ذکیہ طور کا طواف کر رہی تھیں۔جمیلہ رزاق کی بہن نے مجھے پہچان لیا تھا اور ذکیہ طور سے کہا تھا۔ جمیلہ کی دوست اور کلاس فیلو ہے۔میرے خیال میں وہ یقیناً وچولن کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔

جب میں نسخہ لے کر باہر آنے والی تھی۔میرا جی چاہا کہ میں کہہ دوں کہ ڈاکٹر صاحب باہر مریض گرمی میں بے حال آپ کی توجہ کے منتظر ہیں اور آپ ٹھنڈے کمرے میں

عشق کے کھیل کھیل رہے ہیں۔کم ازکم عشق کے لیے یہ وقت تو موزوں نہیں۔

پر میں نے زبان کو لگام ڈال دی تھی۔شاید مجھے خیال آیا تھا کہ اگر ڈاکٹر نے غصہ کرلیا تو یہ دوائی جو مجھے مفت ملنے والی ہے نہیں ملے گی اور میں موقع شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے مصلحت کا تالا منہ پر لگا کر باہر آ گئی۔

اگلے دن جب میں کالج گئی جمیلہ رزاق دیر سے آئی۔میں نے اپنے ساتھ والی کرسی اس کے لیے خالی رکھ چھوڑی تھی۔وہ جب آ کر بیٹھ گئی تو میں نے دھیرے سے اس سے کہا۔

''تم تو بتاتی تھیں کہ ذکیہ طور اپنے پھوپھی زاد سے منسوب ہے پر وہ تو ڈاکٹر محمود کے ساتھ عشق کی پینگیں چڑھا رہی ہے۔''

''کم بخت ذرا دم تو لو کلاس ختم ہونے دو۔ذکیہ طور تیرے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔''اس نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔

جب کلاس ختم ہو گئی اور ہم باہر لان میں آ کر بیٹھ گئیں۔جمیلہ رزاق بولی تھی۔

''ذکیہ طور رات کو تو ٹھیک ٹھاک سوئی پر جب صبح اُٹھی تو بخار بھی تھا اور جسم میں شدید درد بھی۔بہن نے فوراً چائے کے ساتھ بخار کی گولی دے دی۔پر گیارہ بجے بخار کی تیزی کچھ ایسی ہی تھی جیسے اُسے کسی نے دانے بھُننے والی بھٹی میں پھینک دیا ہو۔آپا اسوقت ان کے گھر میں ہی تھی۔فوراً دونوں اُسے ڈاکٹر محمود کے پاس لے گئیں۔ڈاکٹر نے فوری ٹریٹمنٹ دیا اور دو گھنٹوں کے لیے کلینک میں بھی رکھا پر نہ بخار میں کمی ہوئی اور نہ اسکی بے چینی میں۔ذکیہ کی ابتر حالت کے پیش نظر ڈاکٹر محمود نے اسکی بہن کو مشورہ دیا کہ مریضہ کو خصوصی نگہداشت کی ضرورت ہے۔چاہے آپ اسے کسی اسپتال میں لے جائیں یا اسی کلینک میں رہنے دیں۔

بہن سخت گھبرائی ہوئی تھی ۔فوراًبولی ڈاکٹر صاحب آپ پر تو ہمیں پورا اعتماد اور بھروسہ ہے ۔میرے بچے چھوٹے ہیں میں کہاں اسپتالوں میں رُکتی پھروں گی؟

انتہائی توجہ کے باوجود جب رات آٹھ بجے تک مریضہ کی حالت میں اُنیس اکیس کا فرق بھی نہ پڑا تو ڈاکٹر محمود نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو بُلالیا ۔

اب تم ذرا اس صورت حال کو تصور میں لاؤ کہ اُس رات ۹ بجے لاہور کے قابل ترین چھ ڈاکٹروں کا گروپ مریضہ کے سرہانے پائنتی کھڑا صورت حال پر غور کر رہا تھا ۔اب ایسے میں ذکیہ طور کی بہن کا ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنے میں زبان کا سوکھنا سمجھ میں آتا ہے ۔

یہ کہنا کہ ڈاکٹر ذکیہ طور کے حُسن سے متاثر ہوا کچھ مناسب نہیں ۔ڈاکٹر کی اپنی بیوی بڑی حسین تھی وہ تو حُسن کا زخم خوردہ تھا ۔بس اُسے احساس ہوا تھا کہ یہ نوجوان لڑکی ایک خطرناک وائرس کا شکار ہوگئی ہے ۔اسکا فی الفور علاج بہت ضروری ہے ۔فطرتاً ڈاکٹر حد درجہ مہربان اور نرم خو تھا ۔اسکی بہن کی لامتناہی دعاؤں کے سلسلوں نے مریضہ کو کلینک میں رکھنے اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ دینے پر مجبور کر دیا تھا ۔اور اب وہ اُسے مکمل تندرست کر کے بھیجنا چاہتا تھا ۔

بقول آپا کے ذکیہ طور ایک طرح موت کو چھو کر لوٹی تھی ۔تین دن بعد کہیں جا کر اُسکا بخار ٹوٹا اور ہفتہ بھر بعد وہ کہیں اُٹھنے کے قابل ہوئی ۔

ایک دن یوں ہوا کہ ڈاکٹر شام کے مریضوں سے فارغ ہو کر ذکیہ طور کے کمرے میں آیا تھا ۔اس وقت آپا ہی اس کے پاس تھی ۔اس کی بڑی بہن کو آپا نے گھر بھیج دیا تھا ۔آپا کا خیال تھا کہ میں جو یہاں موجود ہوں تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ یوں بھی ذکیہ آپا کی موجودگی میں زیادہ سکون محسوس کرتی تھی ۔

ڈاکٹر جب کمرے میں آیا اس نے ذکیہ کی خیریت دریافت کی ۔مُسکراتے ہوئے

ذکیہ نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب سچی بات ہے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ تو خیر بے معنی سے ہیں۔آپ نے مجھے زندگی دی ہے وگرنہ تو مرنے میں کوئی کسر نہیں تھی''

''ارے ارے ڈاکٹر شرمسار سا ہوتے ہوئے بولا بچانا اور لے جانا تو اُس اوپر والے کا کام ہے،ہم تو بس کوشش کرنے والوں میں سے ہیں۔''

ڈاکٹر اسوقت تھکا ہوا تھا۔چائے پینے کے موڈ میں تھا۔اُس نے ذکیہ سے چائے کے لیے پوچھا اس کے اثبات میں سر ہلانے پر نوکر کو چائے لانے کے لیے کہا گیا۔آپا،ذکیہ اور ڈاکٹر نے چائے پی۔جب ذکیہ نے اچانک پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب اگر آپ میرے اس سوال کو اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ سمجھیں تو بتائیں گے کہ آپ گھر بار چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے ہیں؟''

اور جو کچھ سُنایا گیا اُس میں احساس کی انتہا کو چھونے والا سوز تھا۔قلب کو تڑپانے والا گداز تھا۔اس کے ایک ایک لفظ میں درد کا رچاؤ تھا۔ذکیہ اور آپا دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔بس سمجھ لو کہ یہی لمحہ تھا جب ذکیہ طور دل ہار بیٹھی۔

اب ایسی دلکش اور طرحدار لڑکی مریض ہو اور ڈاکٹر بھی بڑا دکھی ہو تو ایک نیا رشتہ تو جنم لے ہی لیتا ہے۔صبح ناشتہ بھی ڈاکٹر نے ان کے ساتھ ہی کیا۔ذکیہ طور اب بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔

ڈاکٹر اور ذکیہ کی عمروں میں کوئی بیس سال کا فرق ہو گا مگر یہ فرق اسی رات مٹ گیا جس شب کھانا کھانے کے بعد وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔اچانک ذکیہ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو بچے یاد نہیں آتے۔''

اس اچانک سوال پر ڈاکٹر چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکا۔اور جب اُس نے آنکھیں اُٹھا کر ذکیہ کو دیکھا اُسے اُن میں گھائل کر دینے والی کیفیت کا پرتو نظر آیا۔اور جب وہ بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے اسکی زندگی کے ساز کا سب سے دردناک تار بج اٹھا ہو۔

''ذکیہ آپ تو اُس کرب کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں جس میں میں دن رات جلتا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ میں پاگل کیوں نہیں ہو گیا؟ عورت ذات نے میرے یقین اور اعتماد کو پاش پاش کر دیا ہے۔ مجھے دیکھیے۔ چھ فٹی قامت پر اچھے نقش و نگار اور صحت و تندرستی نے میرے وجود کو جاذبِ نظر بنایا ہوا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں بھی تیس سال کے نوجوانوں جیسی پھرتی اور طاقت رکھتا ہوں۔ صاحب ثروت لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔پھر کیا وجہ تھی کہ اُس نے حرام کے راستے اپنائے۔سچ تو یہ ہے کہ اُس عورت نے میرا سارا اعتماد مجروح کر کے مجھے احساس کمتری کے پاتال میں پھینک دیا ہے۔''

ایسی وجیہہ شخصیت کی آنکھوں سے آنسو کیا نکلے ذکیہ طور ہمدردی اور خلوص کے طوفانی ریلے میں بہہ گئی۔ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور ڈاکٹر محمود کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

''ڈاکٹر محمود یہ دنیا ہے قدرت نے ہر انسان کو انفرادی خصوصیات کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ایک عورت کے قصوروار ہونے سے ساری عورتیں موردِ الزام نہیں ٹھہرائی جا سکتیں۔اپنی سوچوں کو مثبت کیجیے۔منفی سوچ اور طرزِ عمل زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے۔آپ اور آپ کی زندگی دونوں بہت قیمتی ہیں۔میں ایسے مسیحا کے لیے خود کو پیش کرتی ہوں۔مجھ پر اعتماد کریں۔''

اس کے نرم و نازک و ملائم سے ننھے ننھے ہاتھ دیر تک ڈاکٹر کے لمبے چوڑے ہاتھوں کے اوپر پڑے رہے۔ان ہاتھوں کے لمس کی گرمی سے ڈاکٹر پگھل گیا۔گلوگیر سے

لہجے میں بولا۔

''میں بہت سادہ دل انسان ہوں۔آپ نے میرا ہاتھ تھاما ہے اب اس تھامنے کی لاج رکھیے۔''

اور یہ کیسی عجیب بات تھی کہ ذکیہ کو اس سے کچھ بھی یاد نہ رہا۔اپنا منگیتر،اپنے رشتہ دار،اپنے بہن بھائی جنہوں نے بہرحال اس رشتہ کی مخالفت کرنا تھی۔وہ تو ہمدردیوں میں اپنی بصارت ہی کھو بیٹھی تھی۔

''مگر ایک بات کا آپ کو بھی وعدہ کرنا ہوگا۔''

''ایک وعدہ کیا ہزار وعدے نبھاؤں گا۔زندگی کی مختار کل آپ ہوں گی۔''

''ماضی کو دفن کر دیں۔اتنا گہرا کہ کبھی کسی حال میں بھی اسکا کوئی رنگ کوئی عکس آپ کے چہرے آنکھوں اور ہونٹوں پر نہ آئے۔''

''وعدہ!'' ڈاکٹر نے اُس کے نرم و نازک ہاتھوں کو تھپتھپایا۔

دونوں کی آنکھیں مسکرائیں اور ہونٹوں کے گلاب کھلے۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ذکیہ اس درجہ طوفانی عشق کرنے والی لڑکی ثابت ہو گی۔اس نے ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ شادی خالصتاً میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اس میں کسی کی مداخلت کو ہرگز پسند نہیں کروں گی۔بڑی بہنوں اور باپ نے سمجھایا کہ کچھ تو سوچو تمہاری پھوپھی کیا کہے گی؟

''کچھ بھی کہے میں نے جو فیصلہ کرنا تھا کر لیا۔''

سب سے بڑی بہن بہت غصے میں تھی۔''جانتی ہو تمہاری عمروں میں کتنا فرق ہے۔تمہارے باپ کی عمر کا ہے وہ۔ابھی چونکہ تمہاری آنکھوں پر جذبات کی پٹیاں چڑھی ہوئی ہیں اس لیے تمہیں کچھ نظر نہیں آتا پر کل پچھتاؤ گی۔''

''پچھتاوے تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہیں جو چیز اسے نہیں ملتی وہ اس کا پچھتاوا بن جاتا ہے۔ کسک تو کسی نہ کسی چیز کی رہتی ہی ہے۔ مسعود کے ساتھ شادی کرلوں گی تو ڈاکٹر کو چھوڑ دینے کی کسک اور پچھتاوا رہے گا۔ اس لیے پچھتاووں کی باتیں آپ چھوڑ دیں۔''

''اور آج کل ذکیہ طور اور ڈاکٹر محمود کے عشق کا سورج نصف النہار پر چمک رہا ہے۔'' جمیلہ رزاق نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو آؤ کینٹین چلتے ہیں کچھ چائے وائے پیتے ہیں۔''

اور میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے سوچ رہی تھی اس ذکیہ طور کا ہر انداز زنرالا ہے۔

میں نے جمیلہ رزاق کو دو تین دن پہلے والا قصہ سُنایا کہ کیسے میں دوائی لینے ڈاکٹر کے پاس گئی اور وہاں ذکیہ طور اور اس کی بڑی بہن کو بیٹھے دیکھا جس پر وہ بولی۔

'' آپا تو دونوں کی یوں کہو کہ مونچھ کا بال بنی ہوئی ہے۔ عشق کے سارے مرحلوں کی وہ رازدار

ہے۔ آج کل بیٹھک کلینک پر جمتی ہے۔ مریض بیچارے باہر سوکھتے رہتے ہیں۔ دیکھ لینا اس کی پریکٹس متاثر ہوگی۔''

اور میں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''عورت کیا اتنی جذباتی ہوتی ہے کہ وہ پل بھر میں عمروں کے سودے کر ڈالے۔''

اور جمیلہ رزاق ہنستے ہوئے بولی۔

''سودے کر بھی لیتی ہے اور توڑ بھی دیتی ہے۔ وفا نبھانے پر آتی ہے تو زندگی کو سولی پر چڑھا دیتی ہے اور بے وفائی پر اُتر آئے تو اچھے بھلے حلال کو چھوڑ کر حرام کے ذائقے چکھتی پھرتی ہے۔ عورت کی بات مت کر۔ کیا شے ہے یہ؟''

اور دو ماہ بعد سننے میں آیا کہ ذکیہ اور ڈاکٹر کی شادی ہوگئی۔ اس کا کوئی رشتہ دار اس

شادی میں شامل نہیں ہوا۔اس کی ایک دوست کے گھر ساری رسمیں ہوئیں اور وہیں سے وہ رخصت ہوئی۔

پھر جمیلہ رزاق کی شادی ہو گئی۔ میں کتابوں کی دُنیا میں گم ہو گئی۔ کتابوں اور ڈگریوں سے فراغت کے بعد شادی اور بچوں کے چکروں میں اُلجھ گئی۔ میکے میں کم کم جانا ہوتا۔ابا بھی اگلی دنیا میں جا بسے تھے۔ایسے میں ڈاکٹر اور ذکیہ طور کے بارے میں کچھ سننے کو نہیں ملا۔

لیکن ایک دن عجیب سا اتفاق ہوا۔

مدتوں بعد میں نے ذکیہ طور کو دیکھا۔وہ بانو بازار میں داخل ہو رہی تھی اور میں نکل رہی تھی میں ٹھٹھکی۔کہاں سرسبز لچکیلی شاخ پر کھلا تر و تازہ گلاب اور کہاں اب۔کتاب میں رکھے کسی خشک پھول کی مانند۔شربتی آنکھوں سے لپکتی روشنی کی جوت بجھی ہوئی۔وہ جلال وہ جمال وہ رعنائی وہ زیبائی سب قصۂ پارینہ تھے۔

بے اختیار میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ہوتا بھی کیسے کبھی بات چیت تو ہوئی نہیں تھی۔

''میں تمہاری ایک خاموش اور دیرینہ پرستار ہوں جس کے ذہنی افق پر آج بھی تمہارے خوبصورت عکس تھرتھراتے ہیں۔''

وہ مسکرائی۔پر یہ کیسی مسکراہٹ تھی یاس میں ڈوبی ہوئی افسردگی کے بوجھ تلے دبی ہوئی۔پھر بے اختیار وہ سوال میرے ہونٹوں پر آ گیا۔

''ڈاکٹر محمود کے ساتھ آپ کی شادی کیسی رہی؟''

''اچھی رہی۔ڈاکٹر اچھا انسان ہے۔مخلص،ہمدرد اور محبت کرنے والا۔''

''پر''

اس 'پر' میں اسکی آنکھوں کے اندر تیرتی پھرتی اُداسیوں اور اُسکے چہرے پر پھیلی افسردگیوں کا راز تھا۔

اور اسے میں جاننا چاہتی تھی۔

''پر کیا؟''

شاید اسی لیے بے اختیار میری زبان سے نکلا تھا۔

ڈاکٹر کی شخصیت کا سارا ڈھانچہ صرف 'ہاں' پر کھڑا ہے۔'نہیں' اسکی زندگی سے منہا ہو گیا ہے۔اور صرف 'ہاں' کے ساتھ گزارہ کتنا مشکل ہے؟

میں احمقوں کیطرح پلکیں جھپکتے ہوئے اسکی صورت دیکھتی تھی۔میرا چہرہ میری کم فہمی اور رہونقوں جیسے احساسات کا عکاس تھا۔اُس نے میری آنکھوں اور چہرے کی اس زبان کو پڑھا اور میرے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے مدھم ٹھہرے ہوئے اور شگفتہ سے لب و لہجے میں بولی تھی۔

''بھلا ساری زندگی بیٹھے پر گزاری جا سکتی ہے؟''

وہ آگے بڑھ گئی تھی اور میں ساکت کھڑی اسکی پشت کو دیکھتی تھی۔

تیرے آنے سے

جب میری آنکھ کھلی میرا سانس سینے میں اُتار اور چڑھاؤ کی اُسی کیفیت سے دوچار تھا جو لوہار کے یہاں دھونکنی کی ہوتی ہے ۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں لحد کی خوفناک تنہائی اور مہیب اندھیرے کی چادر میں لپٹی گُم سُم پڑی ہوں ۔گھبرا کر میں نے ہاتھ بڑھایا اور بتی جلائی ۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں مجھے اپنا آپ کسی بھوت کی مانند نظر آیا تھا۔بوائے کٹ بال سلواڑ کے بوٹوں کی مانند کھڑے تھے ۔ آنکھیں وحشت زدہ ہرنی کی مانند پھٹی ہوئی تھیں ۔ میں نے تپائی پر پڑے پانی کے گلاس کو اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اسے کوئی بیس منٹ میں خالی کیا۔لیکن میرے دل کی وحشت ابھی تک اسی طرح تھی ۔ میں نے سر بیڈ کے کنارے پر رکھتے ہوئے کراہ کر کہا۔

''پروردگار ایسے خواب میرے گلے کا ہار کیوں بن گئے ہیں؟ دنیا سے جانے والے ان لوگوں کا میں نے کیا بگاڑا ہے کہ یہ آئے دن مجھے وحشت زدہ کرنے کے لئے میرے خوابوں میں چلے آتے ہیں ۔''

دراصل بات یہ ہے کہ میں کوئی نیک اور پارسا خاتون نہیں ہوں کہ کہوں مجھے الہام ہوتا ہے ۔ کشف والی بھی کوئی بات نہیں ۔ پر واقعہ یہ ہے کہ مجھے سچے خواب آتے ہیں ۔

بچپن سے لے کر عمر کے اس حصے تک کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا علم مجھے کسی نہ کسی انداز میں ضرور ہوتا رہا ہے۔گذشتہ چند سالوں سے موت کے ظالم ہاتھوں میں میری ننھیال کھلونا بنی ہوئی ہے۔مہینوں پہلے پیش آنے والا واقعہ مجھے کسی نہ کسی انداز میں اپنا رخ دکھاتا ہے۔میں خود فریبی کے جال میں پھنس کر لاکھ کہتی پھروں کہ یہ سب میری سوچوں کا عکس ہیں۔پر حقیقت چند ماہ بعد خوفناک رُخ میں سامنے آجاتی ہے۔اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ میں اپنی سوچوں کے ساتھ ساتھ خوابوں سے بھی خوف زدہ ہوں۔

میرے وہ تمام عزیز اور رشتہ دار جو اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کے شہری بنے ہوئے ہیں۔اکثر و بیشتر میری نیندیں حرام کرنے کے لئے میرے خوابوں میں آتے رہتے ہیں۔آنکھ کھلنے کے بعد رات کا بقیہ حصہ دیکھے ہوئے خواب کا تجزیہ کرنے میں گزر جاتا ہے۔کبھی کبھی میں زچ آکر کہتی ہوں۔

''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔کیوں تنگ کرتے ہو مجھے؟''

کبھی زچ ہو کر،کبھی تلملاتے ہوئے اپنے آپ سے بولے چلی جاتی ہوں۔

''پروردگار یہ حساس ذہن بھی کسی عذاب سے کم نہیں۔''

سچی بات ہے میں نہیں چاہتی کہ خواب میں اپنی عزیز از جان ماں کی صورت دیکھوں۔باپ کا دیدار کروں۔

جنوری کی خنک ترین اس شب میں میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔میں نے انہیں صاف کیا۔قریب پڑے بیٹوں پر نظر ڈالی۔وہ بچپنے کی نیند میں دُھت پڑے سوتے تھے۔سر کہیں تھے اور ٹانگیں کہیں۔

آج میں نے خواب میں اُسے دیکھا تھا جو میری چھوٹی خالہ کی عزیز ترین سہیلی تھیں،جن کا نام ثریا تھا۔جو میرے ننھیال والے گھر کے پچھواڑے رہتی تھیں اور جنہوں نے

جوانی میں ہی موت کا جام پی لیا تھا اور اب تو قصہ پارینہ بنی بیٹھی تھیں۔

آپا جی ثریا جنہیں میرے مرحوم بڑے ماموں جولی آلار کہتے تھے۔ یہ جولی آلار کون تھیں اور آپا جی کس وجہ سے اِس خطاب کی مستحق ٹھہری تھیں۔ بچپنے میں تو خیر کیا سمجھ آتی۔ بڑے ہو کر تاریخ میں جھانکنے اور اُسے کنگھالنے پر بھی میرے پلّے کچھ نہیں پڑا تھا۔ اتنا ساضرور جانا تھا کہ مشہور فرانسیسی مصنف دؤدے کی شریک زندگی کا نام تھا یہ۔ پر وہ جولی آلار تو زبردست قسم کی نقاد اور بہترین لکھاری تھی جو شادی کے بعد مصنف پر ہر جہت سے اثر انداز ہوئی تھی۔ آپا جی کا تو لکھنے لکھانے سے کوئی واسطہ تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ مجھے تو وہ تاریخ کی کتابوں والی نور جہاں کی مانند لگتی تھیں۔

یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ جب میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھی تاریخ کو گھوٹا لگانے میں جُتی ہوئی ہوتی۔ وہ اپنی چھت سے مشترکہ دیوار کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے ہوئے یوں نمودار ہوتی کہ بس یوں محسوس ہوتا جیسے گھور اندھیری رات میں کوئی بے حد روشن چمکدار ستارہ آسمان کے سینے پر ایکا ایکی نمودار ہو گیا ہو۔ ان کے چہرے پر مہاسے اور کیل بہت نکلتے تھے۔ پر اس کے باوجود ان کی صورت کی دلکشی ذرا ماند نہیں پڑی تھی۔ وہ صحن میں جھانکنے والی دیوار پر اپنی پُونی جیسی مخروطی اُنگلیاں رکھتے ہوئے اک ذرا آنگن میں گردن جھکا کر دیکھتیں اور مجھ سے پوچھتیں۔

''فاطمی کدھر ہے؟'' فاطمی میری چھوٹی خالہ کا نِک نیم تھا۔

میں نہایت مؤدب انداز میں اس سرو کے بوٹے کو دیکھتی جو میرے سامنے ایستادہ ہوتا اور جواب میں کہتی۔

''آپا جی اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

گھر کے سارے بچے اُنہیں آپا جی ہی کہتے۔ میرا جواب سُن کر وہ سیڑھیاں اُتر

کر نیچے چھوٹی خالہ کے کمرے میں چلی جاتیں۔

ایک طویل عرصے تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کی کوئی اور بہن بھی ہے؟ میرے خیال میں وہ اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھیں۔ یہ تو کہیں بعد میں پتہ چلا کہ ایک بڑی بہن بھی ہیں جو ایک ظالم شوہر کے پلّے بندھی ہوئی ہیں اور راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ ہمارے گھر میں اُنہیں وہی پیار اور محبت حاصل تھی جو چھوٹی خالہ کو تھی۔ اُونچے اُونچے عہدوں پر فائز میرے دونوں بڑے ماموں اور ان کی کمائیوں پر مان کرتی میری نانی اُنہیں بہت عزیز رکھتی تھیں۔ چھوٹی خالہ اور وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں اور ایک دوسرے کی دیوانی بھی۔

یہ گرمیوں کی ایک سہانی سی شام تھی۔ سارے دن کی جُھلسا دینے والی گرمی کے بعد شام کو ایکا ایکی تیز ہوائیں چلی تھیں اور موسم نہایت خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں نہا کر ابھی باہر ہی آئی تھی۔ جب چھوٹی خالہ نے مجھے کہا۔

''سنو! تم ثریا کے ہاں جاؤ۔ رات وہیں رہنا۔ اس کی والدہ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ اور وہ گھر میں اکیلی ہے۔''

میری باچھیں کِھل گئیں۔ اُن کے گھر جانا اور اُن کے پاس رہنا بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہوگی؟ میری تو وہ آئیڈل شخصیت تھیں۔

چھوٹی خالہ کی کسی بات کو رد کرنا یا اُس کی حکم عدولی کرنا گھر بھر میں کسی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ایک تو وہ بڑے بھائیوں کی لاڈلی چھوٹی بہن دوسرے مزاج کی بھی گرم۔ ہماری اماں تو یوں بھی بے چاری کسی گنتی شمار میں نہ تھیں۔ بھائیوں اور ماں نے اس کی غربت پر ترس کھا کر اپنے محل نما گھر کا ایک کمرہ اسے دے رکھا تھا۔ ایسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی کیا مجال تھی کہ وہ مجھے اس نادر شاہی حکم کی بجا آوری سے روک دیتیں۔

میں نے دیوار کے سوراخوں میں پاؤں رکھے اور دھم سے ان کے چھت پر کود
گئی۔ وہ باورچی خانے میں شاید کچھ پکا رہی تھیں۔ میں نے اُن کے قریب جا کر کہا۔
''السلام علیکم آپا جی! میں آ گئی ہوں۔''
انہوں نے شفقت اور محبت سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں۔
''یہاں آؤ میرے پاس!''
میں ان کے قریب چلی گئی۔ باورچی خانے میں موڑھے پڑے تھے ایک کی طرف
اشارے کرتے ہوئے انہوں نے بیٹھنے اور پھر چائے پینے کو کہا۔
اور جب میں چائے پیتی اور بسکٹ کھاتی تھی وہ بولیں۔
''آج رات میرے پاس رہو گی میں تمہیں کہانی سناؤں گی۔ سسّی اور پنّوں
کی۔''
میں خوش ہو گئی تھی۔ چائے پی کر ہم دونوں صحن میں آ گئیں۔ اس وقت ہوا ایسی
سُبک خرامی سے چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا انسان آنکھیں بند کر کے اس کی لطافت کو اپنے
اندر گھسیڑ لے۔
دفعتاً سیڑھیوں پر دھپ دھپ کی آوازیں آئیں اور پھر ایک خوبصورت دلکش
نوجوان جنگلے کے پاس آ کر رُک گیا۔
عجیب سی بات ہے مجھے اس وقت وہ کہانی یاد آئی تھی جس میں شہزادہ سلیم باغ میں
آ نکلتا ہے اور مہر النساء کے ہاتھوں میں کبوتر پکڑاتا ہے۔
کہانیاں پڑھ پڑھ کر شہزادوں کے جو بُت تراش لئے جاتے ہیں وہ بس ویسا ہی
تھا۔ خوب اُونچا لمبا، گورا چٹا، خوبصورت۔
میں نے ایک نظر آپا جی پر ڈالی تھی۔ اُن کا رنگ تانبے کی مانند سُرخ تھا اور وہ

سامنے آسمان کی اس سمت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں جہاں سورج اپنے شام کے گھر میں ستانے کے لئے جا رہا تھا۔

پھر شہزادہ سلیم ایک ایک قدم اُٹھاتا عین اس جگہ آ کر رُکا جہاں مہر النساء کھڑی تھی۔اس نے ایک نظر ان پر ڈالی۔دوسری آسمان پر اُڑتے پرندوں پر اور پھر بولا۔

''پھوپھی جان کدھر ہیں؟''

''وہ لائل پور گئی ہیں۔ابیّ جان کے دوست بیمار ہیں۔دونوں دیر تک گُم سُم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔پھر جیسے اُنہیں ہوش آیا اور وہ بولیں۔

''آپ بیٹھئے میں چائے بناتی ہوں۔''

اور وہ خوبصورت رعنا جوان شوخی سے مسکرایا اور بولا۔

''شکر ہے آپ کو بٹھانے اور چائے پلانے کا خیال تو آیا۔''

میں اُس وقت اتنی بُدھو نہیں تھی کہ ان کی آنکھوں سے جھانکتے وارفتگی کے جذبوں کو سمجھ نہ سکتی۔چوتھی جماعت سے ہی عشقیہ کہانیاں پڑھ پڑھ کر خاصی سیانی ہوگئی تھی۔

پھر جب اُنہوں نے اُن کے ہاتھوں میں کپ پکڑایا تو وہ بولیں۔

''میں نے تمہیں پرسوں آنے کا کہا تھا تم آئے نہیں۔بتاؤ کیوں نہیں آئے؟ کیا تمہیں مجھے انتظار کی صلیب پر چڑھا کر لُطف ملتا ہے؟''

اور وہ ہنسا۔کتنی دلکش ہنسی تھی اس کی۔میں ہونقوں کی طرح کھڑی اُسے دیکھے چلی جاتی تھی۔

''میں بھی تو اس صلیب پر چڑھتا ہوں۔تم فاطمی کے گھر جاتی ہو اور بھول جاتی ہو کہ تمہارا اپنا گھر بھی ہے اور وہاں کوئی بیٹھا سُوکھتا ہے انتظار کی دُھوپ میں۔''

اور جب کائنات پر سیاہی مائل اندھیرا چھا رہا تھا۔وہ جانے کے لئے اُٹھا۔وہ

اُسے خدا حافظ کہنے سیڑھیوں تک گئیں ۔ میں نے چور آنکھوں سے دیکھا۔ایک سیڑھیاں اُترتے اُترتے مڑ مڑ کر دیکھتا تھا اور دوسرا میری طرف پُشت کئے دیوانہ بنا کھڑا تھا۔ بہت دیر بعد وہ جیسے اپنے حواسوں میں آئیں، لوٹیں اور میرے پاس آکر بولیں ۔

''ہاں تو سلو رانی بتائے کہ وہ کیا کھائے گی؟''

'' آپا جی یہ کون تھے؟'' میں نے کھانے کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے ماموں زاد سلمان حسن ہیں ۔''

اس رات اُنہوں نے مجھے سسّی پُنوں کی کہانی سنائی ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سسّی اور پنُوں کے رُوپ میں خود ہوں ۔

اور جب میں کالج جاتی تھی تب ایک دن مجھے اُن کے بارے میں کچھ یوں سُننے کو ملا ۔میری اماں کہتی تھیں ۔

'' گلاب کا پھول تھی۔باپ نے سرسوں کا بنانے کا طے کرلیا ہے۔بیچاری مُرجھا کر رہ گئی ہے۔''

دوپہر کے وقت اُن کے گھر گئی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ بات کیا ہے؟ چھوٹی خالہ اُن دنوں بڑے ماموں کے پاس گلگت گئی ہوئی تھیں ۔

اُنہوں نے مجھے دیکھتے ہی مُسکرا کر میرا حال احوال پُوچھا۔کالج کی بعض لیکچرار کے بارے میں دریافت کیا۔اُنہوں نے بھی اسلامیہ کالج کوپر روڈ سے ہی پڑھا تھا۔

پھر میں نے کہا۔

'' آپا جی آپ پریشان ہیں؟'' اُنہوں نے ایک لمبی آہ اپنے سینے سے نکالی اور بولی تھیں۔

''تمھیں کیا بتاؤں؟ کاش اس وقت میں انہیں بتا سکتی کہ وہ میرے لئے کیا ہیں؟ مجھے ان کی ذات سے کتنا پیار اور کتنی عقیدت ہے؟''

وہ چھت کو گھورتے ہوئے جانے کہاں گم تھیں۔ میری موجودگی بھی جیسے فراموش کر بیٹھی تھیں۔ بہت دیر بعد ہوش میں آئیں۔ اُس وقت اُن کی آنکھیں موتیوں کے خزانوں سے مالا مال ہو رہی تھیں۔ رُندھی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا تھا۔

''میری جان سلّو تم دعا کرو۔ میرے ابّے جان سلمان کے لئے رضامند نہیں اور میں سلمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''تو یہ بات تھی۔'' مجھ سے وہ کتنی دیر سلمان حسن کی باتیں کرتی رہیں اور میں نے بھی اپنے آپ سے کہا تھا کہ ''جہانگیر کو نور جہاں ضرور ملنی چاہیے۔ رانجھے کو ہیر نہیں ملے گی تو کہانی بگڑ جائے گی۔''

اور کہانی بگڑی نہیں سنور گئی تھی۔ لاڈلی بیٹی باپ کو منوانے میں کامیاب ہوئی۔ نکاح دُھوم دھڑکے سے ہُوا۔ میں اُن کے نکاح میں شامل ہوئی۔ سلمان حسن مغل شہزادہ لگتا تھا۔

چھ ماہ بعد رُخصتی ہوئی۔ وہ دُلہن بن کر صرف ایک رات سُسرال ٹھہریں اور اگلے دن واپس اپنے گھر آ گئیں۔ یہ فریقین کے درمیان طے ہو گیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس رہیں گی۔ سلمان حسن گھر داماد ہو گا۔ اُن کے ماموں نے اس شرط پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ جانتے تھے کہ بہن کا کوئی بیٹا نہیں۔

یہ اُن کی زندگی کا حسین ترین دور تھا۔ وہ ایسی نکھر گئی تھیں کہ چھوٹی خالہ کبھی کبھی کہتیں۔

''ثریا تمھیں تو بیاہ بہت پہلے کر لینا چاہئیے تھا۔''

پھر چھوٹی خالہ کی شادی ہوگئی ۔آپا جی کے امی ابّو فوت ہوگئے ۔سلمان حسن نے بزنس شروع کیااور وہ کامیاب ہوا۔

وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی تھیں ۔گول مٹول خوبصورت اُوپر تلے کے بیٹے بابر اور ٹیپو جنہیں وہ بابری اور ٹیپی کہتے نہ تھکتیں ۔میں کبھی کبھی ان کے گھر چلی جاتی ان کی محبت میں اب ممتا کا رُوپ آ گیا تھا۔وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پیار بھرے انداز میں کہتیں۔

''کہو سلّو بیٹے ،پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

ایسا بھی ہوتا کہ میری موجودگی میں سلمان حسن بھی آ جاتے ۔عجیب سی بات تھی کہ اُن کے آنے کے فوراً بعد میں ایک پل وہاں نہ رُکتی ۔وہ لاکھ بھی کہتیں ۔

''ارے رُکو نا ۔سلمان سے کچھ باتیں کرو۔''

پر میں تیر کی طرح وہاں سے بھاگ آتی۔ میں اُس بے حد دلکش اور ڈیشنگ شخصیت سے متاثر تھی ۔ایک دن اُنہوں نے مجھے کہا کہ

''سلمان بہت اچھا ہاتھ دیکھتے ہیں ۔تم اُنہیں اپنا ہاتھ دکھاؤ۔''

مستقبل کے آئینے میں جھانکنے کا شوق اور تجسّس ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ میں بھی اس کا شکار تھی ۔پر سلمان حسن کے سامنے بیٹھ کر انہیں اپنا ہاتھ دکھانا مجھے کسی طور بھی منظور نہیں تھا۔

''ارے چھوڑیئے آپا جی میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' کہتے ہوئے میں اُن کے بیٹے ٹیپو کو اُٹھا لیتی۔

ایک دن جب میں اُن کے گھر گئی ۔وہ خاموش اور آزردہ سی بیٹھی تھیں ۔بیٹوں کے بارے میں پُوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ پھوپھی کے گھر گئے ہیں۔بیٹی پالنے میں سو رہی تھی ۔

میں نے جھولے کوٹانگ سے ہلاتے ہوئے ننھی زہرہ کے گال پر پیار بھری چٹکی لی اور بولی۔

’’آپ کس قدر افسردہ نظر آتی ہیں؟ کیا سلمان بھائی پھر کسی بیرونی دورے پر ہیں؟‘‘

انہوں نے لمبی سانس بھری۔میری طرف دیکھا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

’’سلوتم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنی ماں کے پیٹ سے نکلی ہوئی بہن کا کوئی بچہ۔فاطمی تو دُکھ سُکھ سُننے کے لئے رہی نہیں۔ساری باتیں تم سے کرلوں تو ہلکی ہو جاتی ہوں۔‘‘

میں اُن کے قریب بیٹھ گئی تھی۔وہ زہرہ کے پالنے کو ہلاتے ہلاتے اُٹھیں اور الماری سے ایک تصویر نکال کر لائیں۔ایک حسین وجمیل اور انتہائی ماڈرن لڑکی کی تصویر میرے ہاتھوں میں تھی اور میں ایک نظر اُسے دیکھتی اور دوسری نظر اُن پر ڈالتی تھی۔اُن کی بولتی آنکھیں مجھ سے کچھ کہتی تھیں۔

’’آپ کی آنکھیں جو کچھ بتا رہی ہیں اُسے زبان دیں تا کہ میں پوری طرح سمجھ سکوں۔‘‘

’’یہ سلمان کی دوست ہے،اُس کی محبوبہ ہے۔اُس کے مراسم کس انداز کے ہیں میں نہیں جانتی۔بس مجھے تو اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دیوانہ ہوا پڑا ہے۔اس کی شامیں اس کے لئے ہیں۔‘‘

اور ساتھ ہی آنکھوں سے رِم جھم کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

میں نے تیزی سے بہتے ان آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا اور کہا۔

’’ایسی دلکش شخصیت ہو،دولت کی فراوانی ہو،وجاہت اور جوانی ہو،مقابل بھی

طرحدار ہوں تو ایمان اپنے پاس کب رہتا ہے؟"

وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں اور آنکھوں کو پوروں سے بار بار صاف کرتی رہیں۔پھر وہ کھانسنے لگی تھیں۔بہت پہلے پلوریسی کا اٹیک ہوا تھا تب وہ کنواری تھیں۔فوری علاج اور خوراک سے بیماری کنٹرول ہو گئی تھی۔لیکن اب جب اُوپر تلے بچوں نے جنم لیا اور غم نے آگھیرا۔وہ پھر بیمار پڑ گئی تھیں۔اس بیماری میں دو اور بیٹیاں آگئیں۔ڈاکٹر نے بہتیرا کہا۔

"زندگی چاہتی ہو تو بچے پیدا کرنے اور غم کھانا چھوڑ دو۔"

لیکن وہ غم کھانا نہ چھوڑ سکیں۔اپنی بیماری سے وہ خود آگاہ تھیں۔چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھتے ہوئے وہ کہتیں۔

"ارے میں مر جاؤں گی ،سلمان دوسری شادی کر لے گا اور میرے بچے برباد ہو جائیں گے۔"

پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سلمان شادی نہ کرے۔شاہ جہاں نے بھی تو ممتاز محل کے بعد بیاہ نہیں کیا تھا۔اگر عورت بچوں کے لئے پوری زندگی تج سکتی ہے تو مرد ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟"

میں نے دُکھ،تاسف اور ہمدردی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"دراصل آپا جی آپ بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔مرد فطرتاً اِن اوصاف کا متحمل ہی نہیں۔اِکا دُکا مثالوں سے اپنے ذہن کو پراگندہ مت کریں۔"

اور جن دنوں میری شادی ہو رہی تھی اُن کی حالت بہت خراب تھی۔وہ گلاب دیوی ہسپتال میں تین ماہ رہ کر آئی تھیں۔گھر کی نچلی منزل میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں۔ان

کے دونوں پھیپھڑے نا کارہ ہو چکے تھے۔ وہ جانے کس حوصلے اور کس قوت ارادی پر گاڑی گھسیٹے لئے جا رہی تھیں ۔ میں جانتی تھی کہ ڈاکٹروں نے اُنہیں چلنے پھرنے سے منع اور مکمل ریسٹ کے لئے کہہ رکھا ہے اس لئے میں نے اُنہیں رسمی طور پر دعوت نامہ بھیجنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پر جب شادی کے کچھ عرصہ بعد میں ایک دن اپنے میکے آئی اور مجھے ان سے ملنے کی ہڑک اُٹھی ۔ میں اُن کے گھر گئی۔ وہ ہنوز اسی حالت میں تھیں ۔ دیکھتے ہی بڑی دُکھی آواز میں بولیں ۔

''تم نے شادی میں ہمیں بُلانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی ۔''

میں سخت شرمندہ ہوئی ۔

''دراصل آپا جی آپ کی شدید بیماری ۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''کمال ہے میں نہ آتی سلمان تو آتے ۔ وہ گلہ کر رہے تھے کہ دیکھو ہمیں پوچھا تک نہیں ۔حقیقت ہے تمہاری شادی میں شرکت کی اُنہیں بڑی خواہش تھی ۔''

''مجھے دلی طور پر افسوس ہوا کہ میں نے بڑی حماقت کی ۔کم ازکم اصولی طور کارڈ بھیجنا چاہیے تھا کوئی آتا نہ آتا ۔یہ اُس کی مرضی ۔''

میں نے اپنی غلطی کی معافی چاہی ۔ایک بار پھر یہ کہا کہ

''مجھے ان کے احساسات کا علم نہیں تھا۔میرے خیال میں اتنے بڑے بزنس مین کے لئے وقت بھی تو مسئلہ ہوتا ہے اور آپ بیمار تھیں ۔''

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی بیماری کے سلسلے میں ان کی دوڑ دھوپ اور ذہنی پریشانی اُٹھانے پر سلمان کی بہت ممنون تھیں ۔بار بار کہے جاتی تھیں ۔

''دیکھو میں نے اُسے کیا سُکھ دیئے ؟ لمبی بیماری اور تفکرات کی چادر میں لپیٹ دیا ۔''

میں نے کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔میری شادی پر چھوٹی خالہ نہیں آئی تھیں وہ اماں سے کچھ ناراض تھیں ۔اُن کے لہجے میں حسرت تھی جب اُنہوں نے کہا۔

''اے کاش! فاطمی آجاتی اوراس بہانے مجھے بھی مل جاتی۔''

جب میں اپنے گھر واپس آئی میرا دل بڑا بوجھل سا تھا۔شاید میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بیماری کی جس سٹیج پر ہیں وہاں سے تندرستی اور زندگی کی جانب آنے والا ہر راستہ بند ہوگیا ہے۔شاید مجھے یہ بھی دُکھ تھا کہ تپ دق کوئی کینسر تھوڑی تھا اور جسے یہ بیماری چمٹی ہوئی تھی وہ کوئی غریب عورت تھی۔خود صاحب جائیداد اور امیر ترین شوہر کی بیوی جو علاج کے لئے اُسے باہر لے جا سکتا تھا۔

کوئی آٹھ ماہ بعد میں نے اُن کی فوتیدگی کی خبر سُنی ۔انجام یہی ہونا تھا۔یہ جانتے ہوئے بھی میرے دل کو دھکا لگا تھا۔

چاہتے ہوئے بھی میں اُن کے گھر نہیں گئی ۔جان سے پیارے ان کے بچوں کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسے اور کس حال میں ہیں؟ سلمان بھائی سے پُرسے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔میں نے کبھی اُن سے کوئی بات نہیں کی تھی ۔

یوں ایک کہانی ختم ہوگئی تھی۔

پر کہانی ختم نہیں ہوتی اس ماں کی جو ننھے مُنے بچے پیچھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اُن کی وفات کے کوئی ایک سال بعد مجھے پتہ چلا کہ سلمان حسن نے شادی کر لی ہے۔اماں نے شاید ان کی دُلہن دیکھی تھی۔میں نے سوچا تھا کہ وہ اپنی کسی ماڈرن سی دوست کو جن کے ساتھ وہ پیار اور محبت کی پینگیں چڑھاتے تھے، گھر لے آئے ہوں گے۔پر ایسا نہیں ہوا۔جو لڑکی اُن کے گھر آئی وہ بقول اماں کے قدرے زیادہ عمر کی، سانولی، تیکھے نقوش کی مالک، پُرکشش لڑکی تھی۔پانچ بچوں پر آنا دل گردے کی بات تھی ۔بچے بھی وہ جو کم عمر اور لاڈ و پیار

میں پلے ہوئے۔

اماں کے گھر سینکڑوں بار میرا جانا ہوا۔ پر کبھی میں نے دیوار پھاند کر اس گھر میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید میں اپنے آپ سے خوفزدہ تھی کہ کہیں میرا اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے نہ بیٹھ جائے۔ بس اماں سے کبھی کبھار سُنتی کہ نہایت نیک لڑکی ہے بچوں کو بہت اچھی طرح رکھتی ہے۔

پھر سُننے میں آیا کہ انہوں نے شامی روڈ پر نئی اور عالیشان کوٹھی بنا لی ہے۔ سلمان حسن کا کاروبار بہت عروج پر ہے۔ سارا گھر اس نئی کوٹھی میں شفٹ کر گیا ہے۔

اور جنوری کی اس خنک ترین شب میں مَیں نے انہیں خواب میں دیکھا تھا۔ وہ میرے گھر آئی تھیں۔ میں نے اُنہیں سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر فوراً لپک کر پکڑا۔ ہنستے ہوئے وہ بولیں۔

''میں نے سوچا میں تمہیں نئے گھر کی مبارکباد دے آؤں اور تم سے مل بھی آؤں۔''

میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ صوفے پر میرے پاس ہی بیٹھ کر انہوں نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پُوچھا تھا۔

''تم اپنے گھر میں خوش و خرّم ہونا۔''

میں ہنس پڑی تھی۔

''آپا جی آپ کی محبت اور دعائیں ہیں۔''

''اِس وقت میں تمہارے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ یہ کام تم نے ضرور کرنا ہے!''

'' حکم کیجیے۔ بتائیے میں حاضر ہوں۔'' میں ہمہ تن متوجہ ہوئی۔

''سلمان فہمیدہ سے بہت لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔'' میں نے فی الفوراُن کے ہاتھ

پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپا جی فہمیدہ کون؟''

''میرے بچوں کی ماں۔وہ سچ مچ میرے بچوں کی ماں ہے۔اس نے جس طرح اُنہیں اپنی بانہوں میں سمیٹا۔جیسے اُن کی پرورش کی میں اس سے باخبر ہوں۔اس نے میرے بابر اور ٹیپو کو ممتا میں نہلا دیا۔اُس نے زہرہ کے بہت ناز اُٹھائے اور وہ میرا بھی خیال رکھتی ہے۔دیکھو تم سلمان کے پاس جاؤ۔وہ تمہارا بڑا مداح ہے۔تمہاری بات سنے گا۔اُسے بتاؤ اُسے سمجھاؤ اُس سے مت اُلجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔میرے بچوں کو اُس کی ضرورت ہے۔بیٹیوں کو ابھی بیاہنا ہے۔میں فہمیدہ سے بہت خوش ہوں۔''

اور اُنہوں نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی تھیں۔

''وعدہ کرو۔جاؤ گی؟ اسے سمجھاؤ گی؟ بچوں سے کہو گی کہ ماں کی عزت کریں؟''

اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔میں انہی کیفیات سے دو چار ہوئی جن کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔دوبارہ آنکھ لگنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

خداوند! وہ میرے پاس کیوں آئیں؟ اس آزمائش کے لئے میں ہی کیوں نظر آئی؟

''کیا واقعی رُوحیں دنیا میں اپنے پیاروں کے پیچھے آتی ہیں اور ان کے بارے میں مضطرب رہتی ہیں۔'' میں نے خود سے سوال کیا۔

یہ سچ ہے کہ ایسا ہوتا ہے پر میں اس گھمبیر مسئلہ میں اُلجھ گئی تھی۔یہ کس قدر مشکل تھا کہ ایک انتہائی کلچرڈ، اُونچی سوسائٹی میں موو کرنے والے حد درجہ وجیہہ مرد کو جا کر یہ کہوں کہ تم

اپنی بیوی سے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دو۔تمہاری مرحومہ بیوی بہت مضطرب ہے۔کتنا مشکل کام تھا۔

پر جانا بھی ضروری تھا کہ پیغام ایک رُوح کا تھا۔

آپا جی کی نند بازار میں ملی ان سے پتہ پوچھا۔ایڈریس ایک ایسی جگہ کا تھا جہاں سواری کے بغیر جانا بہت مشکل تھا۔سوچا کہ میاں کے ساتھ گاڑی میں چلی جاؤں پر میاں کے ساتھ جانے میں مجھے سخت اعتراض تھا۔ذمہ دار پوسٹ پر بیٹھنے والے مرد ضرورت سے زیادہ خوداعتماد ہوتے ہیں اور کسی بھی جگہ، کسی بھی محفل میں بیٹھ کر بیوی باتیں کرے اور وہ خاموش تماشائی بن کر بیٹھیں یہ انہیں گوارہ نہیں۔میرے میاں بھی اسی مرض کا شکار ہیں۔ لہٰذا دیور کی موٹر بائیک پر بیٹھی اور رات کی تاریکی میں گھر ڈھونڈتی ہوئی منزل پر پہنچ گئی۔

دروازہ ایک نوجوان لڑکے نے کھولا۔اندر داخل ہوئی۔ایک خوبصورت اور جدید آسائشوں سے پُر گھر میرے سامنے تھا۔ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر سلمان حسن نیم دراز تھے۔پاس ایک سلونی سی دلکش خدوخال والی خاتون بیٹھی تھی۔خوبصورت سی ایک لڑکی ہو بہو آپا جی کا عکس صوفے کی بیک تھامے کھڑی تھی۔یہ یقیناً زہرہ تھی۔دونوں چھوٹی لڑکیاں بھی کتابیں ہاتھوں میں پکڑے قالین پر بیٹھی تھیں۔

ان کے بچے میرے سامنے تھے۔وہ بچے جنہیں میں جھولے جھلاتی تھی۔گود میں کھلاتی تھی۔خوبصورت اور من موہنے بچے۔اس وقت میرے کانوں میں وہ آواز گونجی تھی۔حسرت و یاس سے بھرپور آواز۔

''ارے سلّو میں نہیں دیکھوں گی تم لوگ دیکھو گی۔''

اور میں دیکھ رہی تھی۔وہ بچے جو ماضی کو نہیں جانتے تھے جو ماضی سے کٹے ہوئے تھے۔

''میں نے صوفے کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور پوچھا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟''

''کیوں نہیں۔'' اُن کی آواز خلوص اور اپنائیت کی مہک لئے ہوئے تھی۔ میں ان کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ماضی کی وہ گلیمرس شخصیت حال کے گرد وغبار میں کچھ کچھ اَٹی ہوئی تھی۔

''آپ خاصے بدل گئے ہیں۔''

وہ ذرا سا مسکرائے اور بولے۔

''درمیان میں وقت کا بھی تو سوچیے۔ حالات اپنا اثر دکھائے بغیر تو نہیں ٹلتے۔''

کیسی دُشوار گھڑی تھی۔ کیسے وہ پیغام اُنہیں دیتی۔ بہرحال جب اُن کی باتیں ختم ہوئیں تو دبے دبے لفظوں میں اپنے خواب کا ذکر کیا۔ وہ چونکے۔ میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔

''خداوندا اس عورت ذات کو سمجھنا کس قدر دشوار ہے؟ جب زندہ تھی تو یہ غم کھاتی تھی کہ میرے مرنے کے بعد تم نے دوسرا بیاہ رچالینا ہے اور میرے بچے برباد ہو جائیں گے۔ اور آج وہ سوت کا غم کھاتی ہے کہ میں اس سے اچھا اور احسن سلوک نہیں کرتا۔''

پھر مُسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور وہ بولے۔

''تم بتاؤ۔ عورت کو سمجھنا واقعی بہت دُشوار ہے نا۔''

''آپ سمجھے نہیں۔''

''عورت پریشان نہیں ہے۔ ممتا پریشان ہے۔ جب زندہ تھی تب بھی اور قبر میں اُتر گئی ہے تب بھی!''

اور یہ کہتے ہوئے میں جانے کے لئے اُٹھ گئی تھی۔

اپنے اپنے جہنم

اماں نے سکھ کا لمبا سانس بھرا تھا۔بان کی کھری چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے گھوں گھوں کرتے پنکھے کی ساری ہَوا اپنی چھاتی پر سمیٹی اور اپنے آپ سے بولیں۔

''مولا تیرا ہزار بار شکر،اس بیٹی کا بوجھ سر سے اُترا۔''

آنگنائی کا چوتھائی حصہ پلاسٹک اور اسٹین لیس سٹیل کے برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہڈیاں اور جھوٹے چاول اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔سارے میں مکھیاں بھن بھن کرتی پھر رہی تھیں۔عام دنوں میں گھر میں ذرا سے گند پر گالیوں اور کوسنوں کا طوفان اُٹھانے والی اماں اس وقت ہر بات سے بے نیاز ہَوا کھانے اور چھالیاں کاٹنے میں مصروف تھیں۔ عتیقہ اپنے کمرے میں تھی اور بہو چھوٹے بیٹے کو دودھ پلا رہی تھی۔

مہمان جا چکے تھے۔

یہ مہمان کوئی غیر نہ تھے اماں کے رشتے دار تھے۔قرابت داری بہت نزدیک کی تھی نہ بہت دُور کی۔بس ڈانڈے کہیں بیچ میں ہی نکلتے تھے۔اماں کو گھر گھرانہ پسند تھا۔ان کی کوششوں سے منگنی کی رسم ادا ہوئی تھی۔

عتیقہ گھر کی آخری بیٹی تھی۔اوسط درجے کا گھرانہ جہاں بیٹیاں باعث رحمت نہیں باعث زحمت ہوتی ہیں۔تین کو خدا خدا کرکے دروازے سے اُٹھایا اب یہ چوتھی

تاڑ جتنی لمبی ہوگئی تھی ۔۔بہت پڑھ لکھ بھی گئی تھی ۔اماں کو ہر آن ہر سے ایسا لگتا جیسے چھاتی پر کوئی بھاری پتھر کی سل دھری ہو۔بس نہ چلتا تھا کیسے اسے پرے ہٹا دے۔

اور اب یہ پرے ہوگئی تھی ۔سینہ اس وقت بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔پر کہیں ہلکی سی چُبھن بھی تھی ۔عتیقہ نہ منگنی کے لئے رضامند تھی نہ شادی کے لئے ۔بہت لائق اور ذہین تھی۔ایم۔ایس سی میں گولڈ میڈل لیا تھا۔پی ایچ ڈی کرنے کے لئے باہر جانے پر بضد تھی ۔پر اماں باہر بھیجنے کے خیال سے ہی ہول کھائے جاتیں ۔دل کی راز دار ہمسائی جو ماں جائی سے بھی بڑھ کر تھی مشورے دیتی نہ تھکتی۔

''بُوا دیکھتی کیا ہو؟ سیدھے سبھاؤ اپنے گھر چلتا کرو۔اتنا پڑھ کر کس ٹلّے پر چڑھنا ہے۔آخر کو بچے جننے ہیں،ہنڈیا،چولہا،چوکا ہی سنبھالنا ہے۔''

اور اماں بھی اُس سے سو فیصد متفق تھیں۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عتیقہ کی دھمکیوں کی پرواہ کی نہ آنسوؤں کی۔مزے سے منگنی کر دی۔پر پھر بھی تھوڑا سا ڈرتی تھیں۔ چند بار اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''یونہی ہوتا ہے لڑکیاں ایسے ہی ٹسوے بہاتی ہیں۔میاں کی چاہت ملے گی، اپنے گھر کا سُکھ ملے گا تو سب کچھ بھول جائے گی۔''

ماں جائی بھی آ گئی تھی۔اماں نے چارپائی پر اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''دو گھڑی آرام کر لیا ہوتا۔سویرے سے کام میں جُتی تھیں!''

''خیر ہے،خوشی کے کاموں میں تھکن نہیں محسوس ہوتی۔''

بڑی بہُو نے بھی اسی وقت آ کر بتایا کہ عتیقہ کمرے میں رو رہی ہے۔

پل بھر کے لئے اماں کے چہرے پر فکرمندی کے سائے لہرا گئے پر ماں جائی نے داہنے ہاتھ کو شانے تک لے جا کر لہراتے ہوئے ''دفع کرو۔رونے دو۔'' جیسے تاثر کو تمثیلی

صورت گری دیتے ہوئے منہ زبانی بھی کہا۔

''ٹھیک ہو جائے گی۔کوئی چنتا مت کرو۔''

پر چنتا تو جیسے اماں کا مقدر بن گیا۔ عتیقہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتی اور شام ڈھلے واپس آتی۔اماں نے نرمی اور پیار سے سمجھانا چاہا مگر وہ کٹ کنی بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر اُن کے پیچھے پڑ گئی۔

''اماں آپ نے مجھے کھلونا سمجھا ہے کہ جب اور جس وقت آپ میری کل دبائیں میں بولنا شروع کر دوں۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق نہیں چلوں گی۔ مجھے ہر صورت پڑھنے کے لئے باہر جانا ہے۔''

اماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔اس کی چنگاریاں برساتی آنکھیں اور زہر اُگلتی زبان اماں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ معاملہ ٹیڑھا ہے اور کسی قسم کی بھی سختی اسے ہوا دے گی۔

ایک دن وہ خاموشی سے سمدھیانے گئیں۔انگوٹھی اور کپڑوں کا جوڑا دونوں چیزیں انہیں لوٹاتے ہوئے شرمندگی سے بولیں۔

''بی میں نے تو چاہا تھا کہ بیٹی دے کر پرانی باڑ کو نیا چھاپہ لگاؤں۔پر لگتا ہے میری یہ خواہش خدا کو منظور نہیں۔ عتیقہ پڑھائی کے لئے باہر جانا چاہتی ہے اور سر دست وہ کسی طور پر بھی شادی کے لئے تیار نہیں۔میں شرمسار ہوں اور تم لوگوں سے معافی چاہتی ہوں۔''

اماں واپس چلی آئیں۔مگر کیسے شکستہ دل، نڈھال سی۔عتیقہ اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔اسے تو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ یہ دیکھے کہ اماں کتنے دُکھ اور کرب میں ہیں جو اُس نے اُنہیں اپنی حماقت سے دیا ہے۔کیسی پیلی پڑ گئی تھیں؟ پر وہ تو ہٹ دھرمی اور سرکشی پر اُتری ہوئی تھی۔

جس دن اُس کا ٹکٹ آ گیا۔ وہ پہلی دفعہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اپنے

کمرے سے نکل کر باورچی خانہ میں اماں کے پاس آئی اور پیڑھی پر اُن کے پاس بیٹھی۔
اماں خاموشی سے برتنوں کی دُھلائی میں مصروف رہیں۔

ایک بار بھی اُنہوں نے بیٹی کو نہ دیکھا۔ عتیقہ نے خود ہی اماں کے داہنے گھٹنے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا اور رقّت بھری آواز میں بولی۔

''اماں پلیز مجھے معاف کر دیں۔میں نے آپ کو بہت دُکھ دیا مگر مجبور ہوں۔ میرے پیشِ نظر صرف پڑھائی ہے۔''

اس سے اماں کو یوں لگا جیسے عتیقہ نے محض رسم پوری کرنے کی خانہ پُری کی ہو اور اماں نے بھی یونہی رسماً ہی کہہ دیا ہو۔

''جاؤ جو چاہتی ہو اس میں کامیابی پاؤ۔''

اور دل جو خلوص اور محبت کی لَو سے جگمگاتے ہیں اُن پر دھندلاہٹ ہی رہی۔

نئی دنیا رنگین اور خوبصورت، اپنوں سے خالی مگر عتیقہ کو اُداسی کا بے نام سا احساس بھی نہ ہوا۔یہاں معیارِ تعلیم بہت اُونچا تھا۔گو عتیقہ گولڈ میڈلسٹ تھی مگر پھر بھی اسے کافی دُشواری کا سامنا کرنا پڑا۔جان رابرٹ اس کا میجر ایڈوائیز نیک دل اور شریف انسان تھا۔ اُس نے عتیقہ کو کافی سہارا دیا۔

دل لگانے کے بارے میں عتیقہ نے بہت کم سوچا تھا۔یہ نہیں کہ اس میں نسوانی اور فطری جذبات کی کمی تھی یا وہ خوش شکل نہ تھی۔عام لڑکیوں کی طرح اُس کے بھی جذبات تھے مگر پہلے وہ زندگی میں کسی بلند مرتبے پر پہنچ جانے کی متمنّی تھی۔اُسے بہت خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا پر پُرکشش تھی۔تیکھے نقوش والا نمکین چہرہ جسے اس نے غازہ وغیرہ سے مزید اچھا بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ دل والا معاملہ بھی بس ایسے ہی ہو گیا۔وہ ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور سے

خریداری کر کے نکل رہی تھی ۔اُس کا اُونچی ایڑی کا جُوتا جانے کیسے پھسلا اور وہ لفافوں سے لدی پھندی دھڑام سے گری اور چار پانچ سیڑھیوں سے قلابازیاں کھاتی نیچے آرہی ۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے ۔

اس وقت تو یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ اُسے بازو سے پکڑ کر سہارا دینے والا کون ہے پر جب وہ چلنے کے لئے کھڑی ہوئی تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔غالباًپاؤں کا گوشت پھٹ گیا تھایاہڈی وغیرہ کریک ہوگئی تھی ۔

''گھبرایئے مت ۔میرے ساتھ آئیں ۔مَیں آپ کوہوسپٹل لئے چلتاہوں ۔''

اب اس نے پیشکش کرنے والے کو دیکھا تھا ۔ بہت دلکش نوجوان نما مرد تھا۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے اس کے شاپنگ کے لفافے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔

اور ساتھ جائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

بمشکل دو قدم چل کر وہ اس کی گاڑی میں بیٹھی ۔

راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی ۔اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سُتا ہوا تھا اور ہونٹ سفید پڑے ہوئے تھے ۔پاؤں کوخفیف سی جھٹک بھی اس کی چیخیں نکال دیتی ۔

اسپتال میں پہنچ کر فوری طور پر اس کا ایکسرے لیا گیا ۔ہڈی مضروب تھی ۔پاؤں پر پلاسٹک چڑھا دیا اور اسے ایڈمٹ کر لیا گیا۔اب اسے پتہ چلا کہ اُسے یہاں تک لانے والا نوجوان نہ صرف مسلمان ہے بلکہ پاکستانی بھی ہے اوراس شہر سے تعلق رکھتا ہے جہاں کی وہ خود ہے ۔وہ ڈاکٹر تھا اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یہاں آیا ہوا تھا اور اسی اسپتال سے منسلک تھا ۔

انکشافات حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگوار بھی تھے ۔

کوئی پابندی تھوڑی تھی اس کا جب جی چاہتا اس کی مزاج پرسی کے لئے آجاتا۔ اس کے پاس بیٹھتا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ لگاتا، چائے کا دور چلتا۔ گانوں کا رسیا تھا۔ ایسے ایسے خوبصورت گانوں کا اس کے پاس ریکارڈ تھا کہ عتیقہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی اب تک کی زندگی کہیں جنگل بیابان میں گزری ہو۔ جہاں رُوح کے تاروں کو چھیڑنے والا کبھی کوئی ساز ہی نہ بجا ہو۔

پندرہ دن بعد جب وہ ٹھیک ہو کر ہوسٹل آئی تو ڈاکٹر ممتاز ہی لے کر آیا تھا۔ گاڑی میں ریکارڈ پلیئر بج رہا تھا اور محمد رفیع نغمہ سرا تھا۔ ڈاکٹر ممتاز نے آواز کو ذرا دھیما کیا اور بولا۔

''کبھی کبھی گیت انسانی جذبات کی کس قدر صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔''

عتیقہ خفیف سا مسکرائی اور بولی۔

''خیال رہے آپ میرے ہوسٹل سے آگے نکل آئے ہیں۔''

''اوہ!'' کہتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز نے اُسے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''چلئے اوپر سے چکر کاٹ کر آتے ہیں۔ اسی بہانے تھوڑی سی قربت اور سہی۔''

گاڑی سے باہر نکل کر اس نے مسکراتی نگاہیں ڈاکٹر پر ڈالیں اور بولی۔

''میں آپ کو اندر آنے کی دعوت نہیں دے سکتی۔ پندرہ دن میری عدم موجودگی کی وجہ سے کمرہ انتہائی ابتر حالت میں ہوگا۔''

''آنا اُدھار۔'' ڈاکٹر ممتاز نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اور لفٹ میں داخل ہو کر جب اس نے تیسری منزل کا بٹن دبایا اور پل بھر میں اپنے کمرہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی تب جانے اُسے کیا ہوا؟ اس کا جی واپس بھاگ جانے کو چاہا۔ لفٹ کا کال بٹن دبانے کے لئے اس نے قدم پیچھے کی طرف بڑھائے جب ایکا ایکی کسی نے اندر سے کہا۔

''پاگل ہوگئی ہو۔ کہاں جانا چاہتی ہو؟ واپس لوٹو!''

اور وہ حواس باختہ سی پلٹ آئی۔

دروازہ کھولا۔ کمرہ میں داخل ہوئی۔ کھڑکیاں کھولیں اور اسی طرح بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ عجیب سے جذبات کا شکار ہو رہی تھی۔

گیارہ بجے وہ اندر آئی تھی اور اب تین بج رہے تھے اور وہ اسی طرح سوچوں میں گم لیٹی ہوئی تھی۔ ان سوچوں میں اگر کبھی سرشاری اور ترنگ کے جذبات اُبھرتے تو یاسیت کے حملے بھی تابڑ توڑ ہوتے۔

''تو مجھے اُس سے پیار ہو گیا ہے؟ محبت ہو گئی ہے جو آج تک کسی سے نہیں ہوئی تھی!''

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ دُکھی سے لہجے میں اپنے آپ سے بولی۔

''یہ اچھا نہیں ہوا۔ میرے تو سارے عزائم، زندگی میں کسی اہم مقام کے حصول کی جدوجہد سبھی پر جھاڑو پھر جائے گا۔ یہ محبت، یہ عشق، یہ تو جی جان کے روگ ہیں۔ انہیں تو وہ پالیں جنہیں کرنے کو کوئی کام نہیں۔''

پر چند لمحوں بعد اُسے کچھ یوں لگتا جیسے وہ اب تک بڑی رُوکھی پھیکی زندگی گزارتی آئی ہو۔ جس میں نام کو چاشنی نہ ہو۔ کسی سے پیار، کسی کی محبت کا احساس بھی انسان کو خود اپنی نظروں میں ہی معتبر کر دیتا ہے۔

شام کو ڈاکٹر ممتاز اس سے ملنے آیا۔ اس کے اُترے ہوئے پژمردہ سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اُس نے پُوچھا۔

''کیا بات ہے؟ تم پریشان سی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟''

''آشرا پنے بارے میں کچھ تو بتا سکو گی۔ کہیں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بلڈ پریشر نارمل ہے؟''

بڑی طنزیہ ہنسی وہ ہنسی۔

''ڈاکٹر ممتاز میں بڑی سخت جان لڑکی ہوں۔ آج تک میرے سر میں ہلکا سا درد نہیں ہوا۔ بلڈ پریشر وغیرہ تو بڑی دُور کی بات ہے۔ میں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ کبھی کسی اُلٹی پلٹی سوچ نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ مگر کچھ یوں لگتا ہے جیسے اب سوچیں اور پریشانیاں میرا مقدر بننے والی ہوں۔''

''ارے نہیں عتیقہ چیزوں کا منفی رُخ تم نے کیوں دیکھنا شروع کر دیا ہے؟''

ڈاکٹر ممتاز نے بہت خلوص اور اپنائیت سے کہا۔

ٹیمز آ چکا تھا۔ گاڑی پارک کر کے دونوں ایک کشتی میں اُتر گئے۔ پہلا پہر زندہ اور جوان تھا۔ منچلے کشتیوں میں بیٹھے شور مچا رہے تھے۔

سیر سے فارغ ہو کر ایک اطالوی ریسٹورانٹ میں انہوں نے کھانا کھایا۔ جب وہ واپسی کے لئے گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی ہلکی رفتار سے اپنے راستے پر بڑھ رہی تھی۔ اس نے بھاری اور بوجھل آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب پردیس میں اپنائیت کے اس اظہار کے لئے میں آپ کی شکرگزار ہوں مگر میری منزل ابھی بہت دُور ہے اور میرے لئے راستے میں ٹھہراؤ بہت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ مجھ سے آئندہ نہیں ملیں گے!''

اور یہ سب کہہ کر اُس نے ڈاکٹر ممتاز کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ آج ریڈیو نہیں بج رہا تھا۔ مکمل خاموشی تھی۔ ڈاکٹر ممتاز نے اس کی بات کا کوئی جواب

نہ دیا۔بس وہ گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔

اور جب وہ گاڑی سے اُتری۔سٹیرنگ کی طرف دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئی ۔ہلکا سا جُھکی اور ڈاکٹر ممتاز کو خدا حافظ کہنے کے لئے زبان کھولی۔وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔اُس کے ہاتھ نے عتیقہ کا داہنا ہاتھ پکڑا اور جذبات سے بوجھل آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

’’عتیقہ۔یہ تو ممکن نہیں کہ میں اب تم سے نہ ملوں ۔انسان اپنی تشنہ کامیوں کی سیرابی لئے نگر نگر پھرتا ہے۔کہیں اُسے کوہر ملتا ہے تو وہ اسے چھوڑ جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ میں تو یوں بھی محرومیوں کا مارا ہوا ہوں۔‘‘

اور کار زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔پریشان سی۔

ڈاکٹر ممتاز اُسے اُس کے خول سے باہر نکال لایا تھا۔کبھی کبھی جب وہ اُلجھی اُلجھی باتیں کرنے لگتی تو وہ رسان سے کہتا۔

’’کیسی احمق لڑکی ہو۔محبت انسان کو اعتماد دیتی ہے۔اور تم ہو کہ ذہن کو اُلٹی پلٹی سوچوں کی چُھریوں سے زخمی کرتی رہتی ہو۔‘‘

جو کچھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور تھا کہ اُس کے شب و روز بہت خوبصورت ہو گئے تھے۔ڈاکٹر ممتاز نے اس کی جمالیاتی حس کو بیدار کیا تھا۔وہ جو سیدھے سادھے کپڑے پہن کر یونہی منہ اُٹھا کر باہر نکل جاتی تھی ۔اب پہننے اوڑھنے کے معاملات میں محتاط ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر اکثر اُسے ٹوکتا۔

’’عورت ہو، بننا سنورنا تمہارا پیدائشی حق ہے۔اس حق سے اپنے آپ کو محروم کیوں کرتی ہو؟‘‘

ویک اینڈ پر ’’لیک ڈسٹرکٹ‘‘ جانے کا پروگرام بن گیا۔عتیقہ نے شروع

میں جانے سے معذرت کی مگر ڈاکٹر ممتاز قدرے غصے سے بولا۔

''کیا ہر وقت نہیں نہیں کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ضرور جانا ہے۔ایسی خوبصورت جگہ ہے کہ انسان قدرت کی صناعیوں پر دنگ رہ جاتا ہے۔''

دونوں دوپہر کے وقت چلے۔ڈاکٹر ممتاز کی ڈرائیورنگ بہت اچھی تھی۔انگلینڈ کی تیز رفتار شاہراہ۔وہ لطف اُٹھا رہی تھی۔

کس قدر دلفریب جگہ تھی۔فطرت اور عہد ساز انسان، دونوں کی موجودگی نے ماحول کو رنگین بنایا ہوا تھا۔وڈزورتھ کو یہاں محسوس کرنا عتیقہ کے لئے بڑا دل خوش کن تجربہ تھا۔اُس کے پاؤں تھک گئے تھے مگر آنکھیں پیاسی تھیں۔

رات گئے ہوٹل میں آئے۔دو کمروں کی بکنگ تھی۔کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ گئے۔کافی اکٹھے پینے کا پروگرام تھا۔

کافی پی کر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ ہوا جو یقیناً نہیں ہونا چاہیے تھا۔مورِدِالزام کسے ٹھہرایا جاتا یہ ذرا مشکل تھا۔ماحول، حالات اور دو محبت کرنے والوں کی یکجائی، سبھی قصوروار تھے۔عتیقہ کی آنکھوں نے ساون بھادوں کی بارش برسادی تھی اور اس ساری بارش کو ڈاکٹر ممتاز کی چھاتی کے گھنے بالوں نے اپنے اندر جذب کیا تھا۔

وہ روتے نہ تھکتی تھی اور ڈاکٹر ممتاز اسے دلاسا اور تسلیاں دیتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔تفریح کا سارا مزہ غارت ہو گیا۔تنگ آ کر ڈاکٹر ممتاز نے اُس سے کہا۔

''خدا کے لئے عتیقہ یہ رونا دھونا بند کرو۔اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں عام مردوں کی طرح تم سے بے وفائی کروں گا تو اس کی توقع مجھ سے کم از کم مت کرو۔میں مرد ہوں وہ مرد جو اپنے وعدے اور اپنی بات پر چٹان کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔میں تم سے شادی کروں گا۔''

دونوں لندن لوٹ آئے۔

عتیقہ چپ چاپ ہوسٹل کے دروازے کے سامنے اُتر کر تیر کی طرح گیٹ میں داخل ہوگئی۔اس نے رُک کر اُسے دیکھنے یا کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

پورا ایک ہفتہ وہ غائب رہی۔ڈاکٹر ممتاز ہر روز آتا اور اُسے پتہ چلتا کہ عتیقہ نہیں ہے۔جہاں جہاں اس کے ہونے کا امکان تھا۔وہاں بھی اُس نے چھاپے مارے مگر بے سود۔وہ بہت پریشان تھا کہ آخر یہ دیوانی لڑکی کہاں غائب ہوگئی؟

برمنگھم میں تیرہ دن گزار کر جب عتیقہ واپس لندن آئی تو کسی حد تک وہ سنبھل گئی تھی۔اُس نے کسی سے ممتاز کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔لیکن لاشعوری طور پر وہ اُس کی آمد کی منتظر ضرور تھی۔ایک دن۔دو دن گزرے کوئی نہیں آیا۔

''اچھا!'' اُس نے بظاہر خاصی بے اعتنائی سے کہا۔

ہفتہ گزر گیا مگر اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔اب وہ پریشان تھی۔جی چاہتا تھا کہ وہ آئے۔اس سے ملے۔اس پر اپنا غصہ جھاڑے۔

ساری انا اور خودداری کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے اسپتال فون کیا پتہ چلا کہ وہ تو گذشتہ چار دنوں سے ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لئے جرمنی گیا ہوا ہے اور ابھی ہفتہ بھر سے قبل اُس کی واپسی ممکن نہیں۔یہ سب جاننے پر وہ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

اُس کے شب و روز میں ایک عجیب سی اُداسی اور یاسیت گھل گئی تھی۔اُس دن وہ بالکونی میں کھڑی باہر دیکھتی تھی۔مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔اتنی تیز بارش کے باوجود لوگوں کی آمد و رفت ذرہ بھر کم نہ تھی۔سرِ شام ہی لندن اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔یہ اور بات تھی کہ مصنوعی روشنیوں نے اندھیرے کا جگر کاٹ کر دن کا سا اُجالا پھیلایا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں آ گئی۔بستر پر بیٹھ گئی۔مضطرب ہو کر پھر اُٹھ بیٹھی۔چکر کاٹنے لگی۔کیسا بے قرار تھا دل؟گزشتہ چار دن سے اُس کی طبیعت خراب تھی۔سامنے کیلنڈر کی تاریخیں اس سے بہت کچھ کہتی تھیں۔

''اللہ!یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے؟''

کُرسی پر وہ نڈھال سی بیٹھی تھی۔اُس کا سر چکرا رہا تھا اور کلیجہ جیسے بوٹیوں میں کٹ رہا تھا۔تین دن سے وہ ٹھنڈے مشروب کے سوا کچھ کھا پی نہ سکی تھی۔

اور عین اُس وقت ڈاکٹر ممتاز کمرے میں داخل ہوا۔اُس کی بند آنکھیں کھلیں۔اُن میں چمک پیدا ہوئی اور پل بھر میں بُجھ گئی۔

''عتیقہ۔'' وہ اُس کے پاس آ کر اس پر جُھکا۔

''یہ تم نے کیسا حلیہ بنالیا ہے؟خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔''

''ممتاز۔معاملہ بہت گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

اور اُس نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''کیا گڑبڑ ہو گئی؟ٹھیک سے بتاؤ۔میں سمجھا نہیں۔'' وہ سخت ہراساں ہو رہا تھا۔

''ڈاکٹر ہو کر سمجھتے نہیں۔'' اُس نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔

اور اس کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر عتیقہ کے حواس گُم ہو گئے۔وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور بولی۔

''اور اب تم بھاگ جاؤ گے۔اور کبھی اپنا آپ مجھے نہیں دکھاؤ گے۔ہے نا؟''

اُس نے بہت سہولت اور آرام سے اُسے کُرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا اپنا قیاس ہے۔''

''ڈاکٹر نے تصدیق کی ہے۔یورن کی رپورٹ سامنے دراز میں پڑی ہے۔''

یہ اضطراری کیفیت تھی یا وہ جذبات سے مغلوب ہوا یا اس پر پیار کا دورہ پڑا۔ عتیقہ کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔بس اس نے اسے اپنی بانہوں کے دائرے میں بھر لیا تھا۔اس کے سر پر اپنا چہرہ ٹکا دیا تھا اور اُس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو بہے تھے۔جو اس کی مانگ پر گرے تھے اور جنہوں نے عتیقہ کو اس کا چہرہ دیکھے بغیر بتایا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔دیر بعد وہ بولا۔

''تمہارا خیال ہے میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا اتنی غلط ریڈنگ ہے تمہاری میرے بارے میں!''

''مرد بالعموم ایسا ہی کرتے ہیں۔'' عتیقہ نے آہستگی سے کہا۔

برستی بارش میں وہ اسی وقت اُسے ایسٹ اینڈ کی مسجد میں لے گیا۔فون کرنے پر تین دوست بھی گئے۔اسلامی تبلیغی مشن سے چند لوگ شریک نکاح ہوئے۔

''مجھے افسوس ہے میں تمہارے لئے عروسی جوڑا اور زیورات نہیں خرید سکا۔اصل میں تم شکوک وشبہات کے جال میں بُری طرح پھنس گئی تھیں اس سے نکالنے کا واحد راستہ یہی تھا۔اگلے ماہ پیرس چلیں گے اور تم ۔۔۔''

عتیقہ نے فوراً اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''گولی مارو کپڑوں اور زیورات کو۔اصل مسئلہ تو ابھی بھی سر پر کھڑا ہے۔''

''کونسا مسئلہ؟'' ممتاز کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''جو گناہ سرزد ہو گیا ہے اس سے بھی تو نجات حاصل کرنا ہے۔''

''یہ کیا کہا ہے تم نے؟ نہیں عتیقہ ہرگز نہیں۔خدا گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔''

عتیقہ اپنے مقدر پر جتنا بھی رشک کرتی کم تھا۔ڈاکٹر ممتاز دیوانگی کی حد تک اُس کا خیال رکھتا تھا۔اُس کا اصرار تھا۔ ''یونیورسٹی جاؤ مگر پڑھائی کے لئے نہیں۔کمرے میں لیٹے رہنے کی بجائے گھوم پھر آؤ۔بس جانے کا یہی پہلو تمہارے سامنے ہونا چاہیے۔''

اُسے تپ چڑھتی۔ ''یہ تم مجھے موم کی گڑیا بنا رہے ہو۔مستقبل کے لئے میرے تو سارے عزائم اور ارادوں کی منصوبہ بندیاں کاغذ کے پُرزوں کی طرح بکھر گئی ہیں۔میں کیا سوچتی اور کیا چاہتی تھی اور یہ سب کیا ہو گیا؟''

''عتیقہ گھبراؤ نہیں تمہاری ڈاکٹریٹ ضرور مکمل ہوگی۔میرا وعدہ ہے تم سے۔''

اُس کی خوراک، اُس کے لباس، اُس کے آرام، ہر بات کی اسے فکر رہتی تھی۔ ایف آر سی ایس کا اُس کا اپنا آخری سال تھا۔حد درجہ مصروف ہونے کے باوجود عتیقہ سے متعلق ہر معاملے میں بُہت حساس تھا۔

بہت خوبصورت سا بیٹا دُنیا میں آیا۔خوشی ڈاکٹر ممتاز کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی۔

''میری شیر خوارگی کے دنوں کی تصویر دیکھو گی تو یوں سمجھو گی کہ جیسے یہ ممتاز کا دوسرا رُوپ ہے۔''

عتیقہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا رُوپ ہی تو ہے۔''

ایک دن جب موسم بہت اَبر آلود تھا۔یخ بستہ ہوائیں برچھی کی طرح آر پار ہوئی جاتی تھیں۔وہ بیٹے کے ساتھ کمرے میں بیٹھی ڈاکٹر ممتاز کی قمیض پر بٹن ٹانک رہی تھی۔

سات ماہ کا بیٹا اپنی عمر سے کہیں زیادہ صحت مند تھا۔کمرہ خوشگوار حد تک گرم تھا۔ عتیقہ قالین پر بیٹھی تھی جب ڈاکٹر ممتاز آیا۔بیٹا کھلونے چھوڑ کر ہمک کر باپ کی گود میں

آ بیٹھا۔

''آج جلدی کیسے آ گئے؟ آپ کا تو آپریشن ڈے تھا۔''

''صرف دو آپریشن کیے ہیں۔''

''کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔'' عتیقہ نے کچھ محسوس کیا اور بولی۔

''کیا بات ہے، چُپ کیوں ہیں؟''

''تم سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔''

''تو کرو۔ تذبذب اور ہچکچاہٹ کیسی ہے؟''

''میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔''

عتیقہ کو اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان گزرا۔ دیر تک گُم سُم پتھر کی کسی مُورتی کی طرح بیٹھی رہی۔ پھر نرمی سے بولی۔

''کیا کہا ہے؟''

''کہنا تو طویل عرصے سے چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔''

''اور اب کیسے کہہ دیا؟''

ڈاکٹر ممتاز نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ قالین پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ عتیقہ کی آنکھوں میں جیسے وحشت سی بھر گئی۔ چیخیں مارنے اور اونچے اونچے رونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یوں لگا جیسے بس دم گھٹ جائے گا۔

''تیسری کب کرو گے؟'' دیر بعد اس نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

اور اس طنز پر ڈاکٹر ممتاز نے سر کو اُٹھا کر اک ذرا عتیقہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غم و یاس کی کیفیات کا کچھ ایسا مد و جزر تھا کہ اسے مزید دیکھنے یا جواب دینے کی تاب ہی نہ ہوئی۔ سر کو دوبارہ قالین پر پٹخ دیا۔

''وہ کیا خوبصورت نہیں ہے؟''

''بہت ہے۔''

''پڑھی لکھی؟''

''ایف ایس سی۔''

''بچے کتنے ہیں؟''

''کوئی نہیں!''

''شادی کو کتنے سال ہوئے؟''

''نو سال!''

سوال جواب کا یہ سلسلہ کسی عدالت کے وکیل اور موکل کی منظر کشی کر رہا تھا۔اب اس نے تلخی سے پوچھا۔

''تو تم نے سارا پاکھنڈ بچے کے لئے پھیلایا؟''

''میرے پاؤں میں کوئی بیڑیاں تھیں جو مجھے دوسری شادی سے روکتی تھیں۔ پاکھنڈ تو تب پھیلایا جاتا ہے جب انسان بے بس ہو۔ بچہ میری محرومی ضرور تھی مگر ایسی نہیں کہ میں پاکھنڈ پھیلاتا پھرتا۔یہ کوئی ضروری ہے کہ حسین چہرے ہی دل کے سنگھاسن پر براجمان ہوں۔کبھی کسی عام سے ذہین انسان کی کوئی ایسی ادا دل کو بھا جاتی ہے کہ آدمی اس کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا ہے۔

یوں بھی میں کہنا چاہوں گا کہ اتنے تابڑ توڑ حملوں کی بجائے اگر تم تھوڑی سی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سن لو تو شاید میں اتنا قصوروار نظر نہ آؤں۔صدف میری چچا زاد میرے بڑے بھائی کی پانچ ماہ کی بیاہی دُلہن میری بیوی اُس وقت بنی جب میں ابھی میڈیکل کے پہلے سال میں تھا۔مجھ سے سات سال بڑا میرا بھائی ایکسیڈنٹ میں مر گیا تو

صرف چھ ماہ بعد میرے ہزار انکار اور ٹکریں مارنے کے باوجود مجھ سے نکاح دی گئی ۔تم اِسے میرے باپ کی ہٹ دھرمی کہہ لو۔میری بزدلی کو شمار کرلو۔پر صرف اتنا سوچ لو کہ انسان کبھی کبھی حالات کے جبر میں جکڑا جاتا ہے۔''

یہ نہیں کہ ڈاکٹر ممتاز کے پیار میں کوئی کمی آئی یا اس کی چاہت میں کوئی فرق پڑا۔ مگر عتیقہ کا دل جیسے ٹوٹ پھوٹ گیا۔تخت سے منہ کے بل فرش پر گرنے والی بات تھی۔ کہاں ایک انسان سارا کا سارا اپنا اور کہاں وہ خانوں میں بٹا ہوا۔

مگر دنوں افسردگی اور یاس میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

''ہم سیدھی سادی سی عورتیں تو یونہی مرد کے وجود اور دل پر اپنے حقوق محفوظ سمجھتی ہیں۔اس کا جب جی چاہے دل اور جسم کے دروازے وا کرلے۔نہ ہم کچھ جان سکتی ہیں اور نہ زبردستی کسی کو دل سے نکال پھینکنے پر قادر ہیں!''

اور وہ اس کے ساتھ واپس پاکستان آئی۔ڈاکٹر ممتاز نے اس سے پوچھا بھی کہ اگر تم چاہتی ہو تو ہم یہیں سیٹ ہو جائیں۔

مگر اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں اپنے وطن واپس جانا ہے۔ہم پر اس کے کچھ حقوق ہیں۔''

دونوں نے اپنے گھروں میں اپنی آمد کی اطلاع نہیں کی۔ڈاکٹر ممتاز نے اپنے بارے میں عتیقہ کو کچھ زیادہ نہیں بتایا ہوا تھا۔کیسی محل نما گھر میں داخل ہوئی تو وہ حیران رہ گئی۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر ممتاز اس قدر امیر انسان ہوگا۔

نوکروں نے بڑھ کر استقبال کیا۔

گھر میں کوئی عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ممتاز نے صدف کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا

کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک دُبلی پتلی عورت اندر آئی۔ ایسی حسین اور خوبصورت کہ عتیقہ کی اسے دیکھ کر سٹی گم ہوگئی۔

لیکن اُس کی آنکھیں۔ اللہ! عتیقہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

ان آنکھوں میں ویرانی تھی۔ ایسی ویرانی جو قبرستانوں کا مقدر ہوتی ہے۔ اُس نے عتیقہ کو پیار کیا۔ بچے کو اُٹھایا۔ چھاتی سے لگایا، چُوما۔

ہونٹوں پر خاموشی کے تالے لگائے عتیقہ یہ سب دیکھتی رہی۔ اُس سے جب آنکھیں چار ہوئیں تو جیسے ان آنکھوں نے زبان بن کر کہا۔

''میرے حُسن کو دیکھتی ہو۔ ایسا حُسن تم نے کہاں دیکھا ہوگا؟ میرے جیسے نصیب اور مقدر والی بھی کہیں کم ہی دیکھی ہوگی۔''

عتیقہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اگر اور یہاں ٹھہری تو اُس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ممتاز غسل کے لئے چلا گیا تھا۔ بچہ ابھی تک اُس کی گود میں تھا۔ جب وہ اُٹھی اور سرپٹ باہر بھاگی۔ راستے اُس کے لئے اجنبی نہ تھے۔ رکشے سے وہ گھر آئی۔ بھابھی اسے یوں دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔

''اماں، بھابی، اماں کہاں ہیں؟''

اور بھابھی نے آنسو بھری آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں اور بولی۔

''اماں تو کوئی پندرہ دن ہوئے فوت ہوگئی ہیں۔''

''فوت ہوگئی ہیں اور آپ نے نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔''

وہ ویسے ہی مڑی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

بھابھی پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئی۔

''عتیقہ اماں کی قبر قبرستان کے آخری سرے پر ہے۔اُس پر اماں کے نام کی تختی بھی ہے۔''

''اماں میں نے تیرا دل دُکھایا تھا۔بول تو نے مجھے بد دعا دی تھی۔اماں تیری بد دعا مجھے لگ گئی۔اماں میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔''

وہ قبر کے سرہانے بیٹھی گھائل ہو رہی تھی۔پاگلوں کی طرح خود کلامی میں باتیں کیے چلی جا رہی تھی۔

جب اچانک دو ہاتھ اُس کے شانوں پر آ گئے۔اپنے سینے سے اُس کا سر لگاتے ہوئے ایک درد بھری آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

''عتیقہ مجھے قبر کی ڈھیری بننے سے بچا لو۔بس خشخاش کے دانے جتنی محبت کی ضرورت ہے مجھے۔''

عتیقہ نے تڑپ کر سر اُٹھایا۔اُن اُداس آنکھوں میں پل بھر کو جھانکا اور برستی آنکھوں اور ہچکیوں کے ساتھ اُس کے سینے میں چہرہ چھپاتے ہوئے اپنی بانہوں کو اُس کے گرد پھیلا دیا۔

قیمتی چیک

نام تھا احمد یار۔کیمیکل ٹیکنولوجی میں ایم۔ایس سی گولڈ میڈلسٹ تھا۔چار غیر ملکی زبانوں کا ماہر،نہایت ذہین فطین قسم کا نوجوان۔کیمیکلز بنانے والی ایک بڑی کمپنی میں کیمیکل انجینئر کےطور کام کرتا تھا۔سن یہی کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔

بڑا کنفرمڈ قسم کا بیچلر تھا۔قریب یا بعید میں شادی کے امکانات بہت کم تھے۔صحت اچھی تھی ۔رنگ گندمی اور نقش گوارا۔خاص بات یہ کہ اس عمر کے عام لوگوں کے برعکس سر میں ایک پکا بال نہ تھا۔ساتھیوں میں اکثر مدّت سے گھر بار والے بن گئے تھے اور اُنکی اکثریت بابا،پاپا کہلوانے لگی تھی ۔یار دوست اکثر ٹھٹھا کرتے ۔

''ہاتھ دیکھو اِسکا۔اس میں شادی کی کوئی لکیر بھی ہے۔''

بعض شوخی سے اُسے دیکھ کر مسکراتے اور کہتے ۔''ارے ابھی تو اپنا احمد بچہ ہے۔ ذرا ہوش سنبھالنے دو اِسے ۔بھئی ہوجائے گی شادی بھی ۔''

وہ سب کی سنتا رہتا اور اپنے گھمبیر سے چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرے رکھتا۔نہ لبوں کو کھولتا اور نہ کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتا۔

اُسکا ایک دوست منصور فضائیہ میں ونگ کمانڈر تھا۔کئی سال انہوں نے اکٹھے پڑھا تھا۔وہ جب بھی آتا اُسکے گھر حاضری دینا نہ بھولتا۔اسکے بیڈ کی پائنتی پر لیٹ کر

ایک زوردار لات اُسکے کولھے پر جماتا اور کہتا۔

''ویسے تو تم سانڈ نظر آتے ہو پر اندر سے کہیں پھوک تو نہیں ہو۔''

وہ مسکرا کر صرف اتنا کہتا۔

''بکواس مت کرو۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔احمد یار کے شانے پر دو ہتڑ جماتا اور اپنا منہ اُسکے کان کے پاس لاکر سرگوشی کے انداز میں کہتا۔

''یار کہیں گے(Gay) وے کا سلسلہ تو نہیں۔''

احمد یار دھاڑتا۔''انسان بنو۔''

چند اور بے تکلف دوست تھے جنہیں اُسکے گھر نہ بسنے کا شدید قلق تھا وہ بھی اکثر پوچھتے رہتے۔

''اماں یار بتاؤ تو سہی آخر تم کیسی لڑکی چاہتے ہو؟''

جان چھڑانے کے لئے وہ لمبی چوڑی شرائط بیان کر دیتا۔اس پر یار لوگ قہقہے لگاتے طنز کرتے اور کہتے۔

''میاں احمد یار کبھی آئینے میں اپنے آپ کو بھی دیکھ لیا کرو۔ایسی حوریں گلفام شہزادوں کو ملتی ہیں۔''

اُسکے دوستوں میں چند ایسے بھی تھے جو اُسکے اندر کا رتی رتی حال جانتے تھے۔وہ جب بھی اکٹھے ہوتے ایک دوسرے سے کہتے۔

یار کوئی ہے جو اسے ''وکٹر کراوچنکو'' کی ''I choose freedom'' پڑھائے۔اس بُزدل بندے میں کچھ جرات اور حوصلہ پیدا ہو۔جن ناروا پابندیوں کی زنجیروں میں اسکے باپ نے اسے جکڑا ہوا ہے وہ یہ توڑے۔بند ہونٹوں کو کھولے۔

ایک دو جوشیلے دوست چلا کر کہتے۔

''تم منہ میں گھنگھناں ڈالے رکھنا۔تمہارے باپ کو تمہاری کمائی کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔بینک بیلنس تگڑا کر رہا ہے وہ اپنا۔یونہی کاٹھ کے اُلو بنے رہنا۔''

بیٹا احمد یار تھا تو باپ غلام مجتبےٰ۔وہ اسکول ماسٹر تھا۔پرائمری اسکول ماسٹر کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے۔۔گاؤں میں دو کھیت تھے۔گھر میں تھوک کے حساب سے بچے، بوڑھے والدین ،ایک اپاہج بھائی اور ایک بیوہ بہن۔غریبی نے اکٹوپس کیطرح غلام مجتبےٰ کے گھرانے کو اپنے پنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔قناعت نام کی کوئی شے اُسکے وجود میں نہیں تھی۔طبیعت میں جلال،خمیر میں لالچ۔ذرا سی بات پر چھوٹے بڑے کو روئی کیطرح دھنک ڈالتا۔

غریبی کو امیری سے بدلنے کی دُھن میں دھواں دھار بولتا۔گھر والوں کو آنگن میں بٹھا لیتا اور چودہریوں اور نمبرداروں کے خلاف زہر اُگلتا۔تدبیروں کے گھوڑے دوڑاتا شعلہ بیان تقریروں سے ایک ایک کے ذہن میں یہ ڈالنے کی کوشش کرتا کہ امیر اور کھاتے پیتے لوگ ظالم ہیں۔تمہیں اپنا حق حاصل کرنا ہے۔غریبی کی اِس دلدل سے باہر نکلنا ہے۔معاشرے میں سر اٹھا کر چلنا ہے۔

اُسکا ذہن ہمہ وقت اِسی گھمن گھیری میں اُلجھا رہتا کہ کب اور کہاں اُسنے کونسا پوائنٹ اپنے موقف کی حمایت میں کہنا ہے۔اپنے آپ سے قسم کھا بیٹھا تھا کہ اب غریب نہیں رہنا۔چونکہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اس لئے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا۔بڑے بیٹے کو انجینئر بنانے کا خواہشمند تھا۔مگر جب وہ ایف۔ایس سی میں دوسری مرتبہ فیل ہوا تو اُسنے اُسے اتنا پیٹا کہ وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔لاہور آیا پھر کراچی پہنچا اور کراچی سے دھکے کھاتا کھاتا لندن پہنچ گیا۔وہاں پہلے محنت مزدوری کی پھر رفتہ رفتہ پیر جما لئے۔جب پہلی

بار اُسنے باپ کو پندرہ ہزار روپے بھیجے تب ایک مدت بعد وہ کھلکھلا کر ہنسا اور اپنے گھر میں بچوں کے درمیان گھل مل کر بیٹھا۔یقیناً اُسنے لکشمی دیوی کو اپنے گھر کی دہلیز میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

احمد یار اس وقت دسویں میں تھا۔باپ اسکی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔

''شہر یار نے مجھے بہت مایوس کیا۔چلو اللہ کو ایسے ہی منظور تھا مگر اب تم خوب پڑھنا۔''

شہر یار بھی لندن سے لکھتا۔''دیکھو احمد میری طرح نہ کرنا۔جی لگا کر محنت کرتے رہنا بغیر تعلیم کے مقدر میں مزدوریاں رہ جاتی ہیں۔کہنے کو میں اب سیٹ ہو گیا ہوں مگر جو شان پڑھے لکھوں کی ہوتی ہے وہ میری نہیں۔''

احمد یار بہت حساس،کم گو اور محنتی لڑکا تھا۔دل جمعی سے پڑھتے پڑھتے اُسنے ایم۔ایس سی کر لی اور مزید خوش قسمتی یہ کہ اچھی ملازمت بھی مل گئی۔

شہر یار لندن سے ڈھیروں روپیہ بھیج رہا تھا۔رشتے دار اور میل ملاپ والے غلام مجتبےٰ کی مالی حیثیت سے متاثر ہو رہے تھے۔اکثر شہر یار کی شادی کا ذکر چھیڑ بیٹھتے۔کچھ تو یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے۔شادی کر دو اُسکی اب۔کماؤ پوت ہے۔کسی میم سے دو بول پڑھا لئے تو ہمیشہ کیلئے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

غلام مجتبےٰ بھی انہی گھمن گھیریوں میں غرق تھا۔سوچتا تھا کہ شادی کرنے سے گھر میں آتی مایا میں کمی کا ڈر تو تھا پر اسکے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کہیں ساری کے چکر میں آدھی سے بھی جائے والی بات نہ ہو جائے۔

شہر یار کی شادی وہ اونچے گھرانے کی کسی خوش شکل پڑھی لکھی لڑکی سے کرنے کا خواہشمند تھا۔برادری سے باہر بھی وہ رشتہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔

اِدھراُدھرتاک جھانک سن گن لیتے لیتے اُسکی نظریں جس امیدوار پر آ کر ٹھہریں وہ آرمی کا رٹیائرڈ میجر تھا۔تگڑا زمیندار تھا۔اسکی کئی لڑکیاں تھیں۔اطلاع کے مطابق سبھی خوشکل اور پڑھی لکھی تھیں۔وہاں رشتہ کرنے پر اُسکا دل ٹھکا۔لیکن جب گھر میں بات کی ماں نے کہا۔

''سوچ لو۔سنتے ہیں بہت ہوشیار آدمی ہے۔''

''ارے رہنے دو ماں۔مجھ سے زیادہ بھی ہوشیار ہوسکتا ہے۔''اُسنے مونچھوں کو تاؤدیا اور سینہ پھلایا۔

بہن نے بھی دبی زبان سے کہا''غلام مجتبےٰ بہتر تھا کہ تم اپنے ہی جیسے کسی گھر میں رشتہ کرتے۔امیر گھر کی لڑکی مسائل پیدا کرسکتی ہے۔

اُسنے کوبرا سانپ کیطرح شوکر ماری اور کالی گرگابی کی ایڑی سے آنگن کی مٹی کا سینہ کوٹتے ہوئے بولا۔

''تم تو دل سے چاہتی ہو کہ ہم سدا غریبی کے جہنم میں ہی سڑتے رہیں۔ارے پہلے اپنے بہن بھائیوں کو پالتا رہا پھر بیوی کے ہوتوں سوتوں کو پالنے میں لگ جائے گا۔''

بہن نے منہ پر انگلی رکھ کرلبوں کو بند کرلیا۔کیا ضرورت تھی بات بڑھانے یا بحث کرنے کی؟ وہ تو بال نوچنے کو پڑتا تھا۔

رشتہ طے پا گیا۔منگنی دھوم دھام سے ہوئی۔سارے گاؤں میں واہ واہ ہوگئی۔میجر نے لڑکے کی تصویر کو ہزار روپے کے نوٹ پہنائے۔

زمانہ سستا تھا۔سو روپیہ بڑی بات تھی۔ہزار کے تو کہنے ہی کیا؟

شادی کی تاریخ طے ہوئی۔لڑکے کو آنے کیلئے لکھا گیا اُسکا جواب آیا۔میرا آنا مشکل ہے۔ٹیلیفون پر نکاح کردیں۔مجبوری تھی۔بات مان لی گئی۔

نکاح سے ایک ہفتہ قبل غلام مجتبےٰ گھبرائی ہوئی صورت کے ساتھ بیٹے کی سُسرال گیا۔ تنہائی میں سمدھی کو بتایا کہ وہ دُلہن کے زیورات اور دوسری چیزوں کی خریداری کیلئے شہر گیا تھا۔ جیب میں پچاس ہزار روپیہ تھا جو کسی گرہ کٹ نے اڑا لیا۔ اب پریشانی سی پریشانی ہے۔

سمدھی بیچارہ سوچ میں پڑ گیا۔ سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہو گئی تھی۔ نہ اگلے بنے نہ نگلے۔ بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔ فیصلہ ہوا کہ جگ ہنسائی کا موقع نہ دیا جائے اور عزت بچائی جائے۔ چنانچہ پیسہ دے دیا گیا البتہ میجر صاحب نے یہ ضرور کہا۔

''یہ میری اور تمہاری عزت کا سوال ہے۔ قرض کہیں تمہارے اور میرے درمیان دیوار نہ بن جائے۔''

''گھبرایئے نہیں۔ غلام مجتبےٰ نے اُسکا ہاتھ دبایا۔ بس دو تین ماہ کی بات ہے۔ فصل تیار کھڑی ہے۔ کٹائی شروع ہوتے ہی فکر کروں گا۔ میجر صاحب مطمئین ہو گئے۔

شان و شوکت اور دھوم دھڑ کے سے نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد میجر صاحب توقع کر رہے تھے کہ قرض دی گئی رقم بن مانگے مل جائے گی۔ لیکن دوسری طرف اسکا کچھ ذکر نہ تھا۔ دو ماہ بعد دبی زبان سے پیسے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن سنی ان سنی کر دی گئی۔ ایک ماہ بعد پھر بات ہوئی اِس بار لہجے میں ذرا تلخی تھا۔ غلام مجتبےٰ چنگاری کیطرح بھڑک اٹھا۔ چیخ کر بولا۔

''تو لڑکی کا باپ ہو کر غُراتا ہے۔ میں نے بھی اُسے ساری عمر گھر میں بٹھائے نہ رکھا تو غلام مجتبےٰ نام نہیں۔''

لڑکی کے باپ نے بھی سردی گرمی دکھانے کی کوشش کی۔ اُسی دن اُسنے بیٹے کو خط لکھا۔

''وہ بیٹی کو تین کپڑوں میں رُخصت کرنا چاہتا ہے۔ذلیل کہیں کا۔اُسکا خیال ہے داماد لندن میں ہے۔بیٹی کا جہیز اُسکی سُسرال کو استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔اُسنے مجھے ذلیل کیا۔برادری میں میری ناک کاٹ دی ہے۔مجھے بات کرنے جوگا نہیں چھوڑا۔میں چاہتا ہوں تم فوراً اُسے طلاق بھیج دو۔

شہریار خط پڑھ کر گنگ سا ہو گیا۔

''طلاق ''

اُسنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اپنے آپ سے کہا۔

''طلاق بھیج دوں مگر کیوں؟ابھی تو میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔اُسنے ہاتھوں پر جو مہندی لگائی ابھی تو اُسکا رنگ بھی پوری طرح نہیں اُترا ہوگا۔ابھی تو سہاگ کے جوڑے کو اُسنے ایکبار بھی نہیں دھویا ہوگا۔نہ جانے کیسے کیسے خواب اُسنے دیکھے ہونگے؟اس سے پہلے کہ اِن خوابوں کی اُسے تعبیر ملے میں اس کے ہاتھ میں طلاق نامہ پکڑا دوں۔یہ کس قدر ظالمانہ بات ہوگی؟میرے خدایہ کس قدر ظلم ہوگا؟نہیں نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔''

اسکے باپ نے خطوں کی ڈاک بٹھادی تھی۔''میری عزت کو اُسنے دو کوڑی کا کردیا ہے۔تم کیسے بیٹے ہو جسے میرے وقار کی پروا نہیں۔''

ان دیکھی محبت اور فرض میں جنگ شروع ہوگئی تھی۔ان دیکھی محبت کا پلڑا بھاری رہا۔فرض غلطی پر تھا۔ضمیر اس پر مطمئن تھا۔

اُنہی دنوں اُسے اپنے سُسر کا خط ملا ایسا دردناک جسے پڑھ کر اُسکی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔اُسنے ٹکٹ اور ویزا سُسرال بھیج دیا۔باپ کو پتہ چلا تو کوئلوں پر لوٹ گیا۔مگر کیا ہو سکتا تھا؟

احمد یار طبعاً بہت شریف نوجوان تھا۔اسکی شادی کے گھر میں جتنی بار بھی چرچے

ہوئے وہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے اُن میں شامل ہوا۔مگر جب امریکہ میں مقیم کسی دور پار رشتے دار جو اپنی دو بیٹیوں کی پاکستان میں شادی کا خواہشمند تھا کے ہاں اسکی اور چھوٹے بھائی احمد سلمان کی بات چیت چلانے کا فیصلہ ہو تو اسنے کہنا ضروری سمجھا۔

''باہر کے ماحول کی پروردہ لڑکیوں کا یہاں ایڈجسٹ ہونا مشکل ہے۔بہت زیادہ ماڈرن کی مجھے ضرورت نہیں۔''

''ان کا باپ پاکستان میں انکی شادی کا خواہاں ہے۔لڑکیاں اس ماحول میں اپنے آپکو ایڈجسٹ کر سکیں گی یا نہیں۔یہ امر تو اُس سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ظاہر ہے وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہاں آیا ہوگا۔لڑکیاں ضرور خوبصورت ہونگی۔صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ہمیں اور کیا چاہیے؟باپ نے وضاحت کردی۔

''ضرور خوبصورت ہوں گی پر آزاد خیال بھی ہونگی۔یہ آزاد خیالی بعد میں بہت ستائے گی آپ لوگوں کو۔''احمد یار نے یہ کہنا بہت ضروری سمجھا۔

''ہر بات کا تاریک پہلو مت دیکھو''احمد سلیمان نے جب یہ کہا۔احمد یار خاموش ہو گیا۔پھر سب کی متفقہ رائے سے محمد اقبال کو دعوت طعام دی گئی۔کافی اہتمام کیا گیا۔احمد یار سے اسکی خوب باتیں ہوئیں۔اُسنے دونوں بھائیوں کو پسند کیا۔

''لڑکے شریف اور بہت لائق ہیں۔انکے مستقبل روشن ہیں۔امریکہ بھی بلایا جا سکتا ہے۔اپنی برادری ہے اس سے بڑھ کر اچھے لوگ ملیں گے۔''اُسنے سوچا اور بات کھل کر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

کھانے کے بعد اُس نے اپنا مدّعا ظاہر کر دیا۔مغرب میں طویل عرصے سے مقیم ہونے سے وہ تکلفات اور مصنوعی رکھ رکھاؤ کا قائل نہیں تھا۔اُسنے احمد یار اور اسکی والدہ کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا ہوں آپ سب لوگ لڑکیاں دیکھ لیں۔''

احمد یار کی والدہ نے دھیرے سے کہا۔

''اللہ کرے یہ رشتہ پروان چڑھے۔''

لڑکیاں دکھانے کا انتظام لاہور ہی میں کیا گیا۔یہ ماڈل ٹاؤن کی ایک شاندار کوٹھی تھی جسمیں محمد اقبال کا دوست رہتا تھا۔احمد یار اپنے والدین ، بھائی اور دونوں بہنوں کو گاؤں سے لے آیا تھا۔

وسیع و عریض جگمگاتے ڈرائینگ روم میں دونوں لڑکیاں زمین کی نہیں آسمان کی مخلوق نظر آئی تھیں۔ یہ میک اپ کی کرشمہ سازی تھی یا اس جگمگاتے ماحول کا اثر تھا یا وہ واقعی ایسی لاجواب تھیں۔احمد یار کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔بہر حال سب لوگوں نے دل و جان سے لڑکیوں کو پسند کیا تھا۔کچھ اتنی زیادہ ماڈرن بھی نہ تھیں ۔اس بات کی بھی تسلی ہوگئی تھی۔باتیں کرنے کا انداز ڈیسینٹ تھا۔چائے کے بعد وہ ان سب کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ساری عمر گاؤں کے ماحول میں گذارنے کے باوجود احمد یار کی والدہ کو لڑکیاں پسند آئیں۔

اُس نے اپنے جی میں کہا تھا۔

''بیاہ کر لے جاؤں تو سارے گاؤں میں دھوم مچ جائے گی ۔لوگ کہیں گے کہ نچھو بیگم آسمان سے تارے توڑ لائی ہے۔''

گاؤں کا مکان کو پکا تھا پر چھوٹا تھا۔احمد یار سے چھوٹا لڑکا احمد سلمان ذرا منہ پھٹ قسم کا تھا۔اُسنے باپ سے کہا۔

''دوستیاں آپ لوگ ہاتھیوں والوں سے پال رہے ہیں۔اور دروازے آپ لوگوں کے چھوٹے ہیں،انہیں اونچا کریں وگرنہ سر پھٹ جائیں گے۔''

بات خاصی کڑوی تھی مگر سچی تھی۔ گھر کو گرا کر خوبصورت مکان بنایا گیا۔ احمد یار نے پروجیکٹ کی کالونی میں کوٹھی کیلئے درخواست دی جو فی الفور منظور ہوگی۔ یوں شہر میں بھی اچھی رہائش کا بندوبست ہوگیا۔

شادی کے معاملات تیزی سے طے پا رہے تھے۔

جب یہ سانحہ ہوا اور احمد کو ہلا گیا۔

ملگجی سی ایک شام کو اُسنے کینٹ کی ایک کشادہ سڑک پر چھوٹی لڑکی کو دو غیر ملکی لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ احمد یار نے گاڑی کو ایک طرف پارک کیا اور ایک گھنے درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر اُسکا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ اُسنے گہری نیلی جینز پر بغیر آستین کا بلاوز پہنا ہوا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ انکی بوتل گرین ٹیوٹا پاس کھڑی تھی۔ وہ سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔

اور احمد یار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

''ہم تو چمکتے پیتل پر سونے کا گمان کرتے ہوئے دل ہار بیٹھے۔ اب یہ ہماری حماقت نہیں تو اور کیا تھی کہ ہم نے اُن لڑکیوں سے جن کی آنکھ مغربی معاشرے میں کھلی اور جن کی ساری تربیت وہاں ہوئی اپنے لئے نعمت خداوندی سمجھ بیٹھے۔

اور پھر منگنی توڑ دی گئی۔

یہ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ احمد یار پلانٹ کا معائنہ کر کے واپس اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا جب اُسے ایک کارڈ ملا۔ ملاقاتی کو اُسنے اندر بلوالیا۔ آنے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ پیکٹ اُسنے آفس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

اسے ونگ کمانڈر منصور نے بھیجا ہے مسز علی کیلئے ہے۔ اور ساتھ ہی جیب سے خط نکال کر اُسکی طرف بڑھا دیا۔ احمد یار نے خط اُسکے ہاتھ سے لیتے ہوئے اُسے بیٹھنے کیلئے

کہا۔مگر آنے والے نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ بہت جلدی میں ہے اور اُسے کہیں جانا ہے؟

رقعہ اُسکے دوست ونگ کمانڈر منصور کی طرف سے تھا۔جس نے لکھا تھا کہ وہ گذشتہ ماہ انگلینڈ گیا تھا۔اُسکے جگری دوست نے یہ پیکٹ اپنی بہن مسز تہمینہ علی کیلئے بھیجا ہے۔مسز تہمینہ علی احمد یار کی ماموں زاد بھائی کی بیوی تھی۔مگر دونوں خاندان کا آپس میں میل ملاپ بہت کم تھا۔احمد یار کا ماموں اپنے بہنوئی سے سخت الرجک تھا۔

خط کے آخر میں احمد یار کو تاکید کی گئی تھی کہ فی الفور اس پیکٹ کو لکھے گئے ایڈریس پر پہنچادے۔

دفتر سے اٹھتے ہوئے اُسنے سوچا ابھی پہنچا آؤں۔مگر پھر وہ اپنے آپ سے بولا۔

''چھوڑ ویار۔شام کو جاؤں گا۔دوپہر بہت گرم ہے۔اور گھر بھی تلاش کرنا ہے۔کباڑہ ہوجائے گا۔''

پیکٹ اُسنے کار کی عقبی نشست پر رکھا اور گھر آ گیا۔شام کو ساڑھے پانچ بجے وہ گھر سے نکلا۔

مکان ڈوھنڈنے میں تو اتنی دقت نہ ہوئی۔کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ یہاں دوبار آچکا تھا۔مگر کال بیل بجا کر کھڑے کھڑے سوکھنے والی بات ہوگئی تھی۔گھر لاک بھی نہیں لگتا تھا۔آخری بار اُسنے انگشت شہادت بیل پر رکھی اور خود سے بولا۔

''عجیب لوگ ہیں۔''

اور جب قریب تھا کہ وہ واپس مڑے۔تیزی سے مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور عنابی ڈوپٹے کے ہالے میں ایک کندن سا چہرہ باہر جھانکا۔

''کس سے ملنا ہے آپکو؟'' آواز بڑی میٹھی اور ملائمت سے بھری ہوئی تھی۔

''مسز علی گھر پر ہیں؟'' وہ رُک گیا۔

اس کندن کیطرح چمکتے چہرے پر تذبذب جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔

وہ گھر پر نہیں ہیں اور دو تین گھنٹوں سے قبل انکی واپسی بھی ممکن نہیں۔

''اچھی بات۔'' اُسنے پیکٹ آگے بڑھایا اور کہا۔

''یہ انہیں دے دیجئے''۔ انکے بھائی نے لندن سے ونگ کمانڈر منصور ہاتھ انکے لئے بھجوایا ہے۔''

لڑکی نے بغیر کچھ کہے پیکٹ پکڑلیا اور دروازہ بھی بند کرلیا، پر ہوا یوں کہ صرف چند منٹ بعد ہی وہ مسز تہمینہ علی کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا جب مسز تہمینہ علی آگئیں۔ علیک سلیک کے بعد اُسے گاڑی سے اُتار کر اندر لے آئیں۔

''ثمو پلیز مہمان کو کچھ کھلائے پلائے بغیر ہی بھیج دینا تھا۔''

وہ گھر میں داخل ہوتے ہی پکاریں۔

''سوری آپکو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ میں دراصل عصر کی نماز ادا کررہی تھی۔''

اور یہ ثمو کمال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ چال، ڈھال، لباس اور بولنے کا انداز بھی بڑے دل نشین سے تھے۔

مسز تہمینہ علی خاصی باتونی عورت تھیں۔ شربت کا دوسرا گلاس ختم ہونے تک وہ ثمو کے بارے میں جان چکا تھا کہ وہ مسز تہمینہ علی کی فسٹ کزن ہیں۔ ملتان کی ذکریا یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی ہے اور اب ایم فل میں داخلے کی خواہشمند ہے۔

ماں باپ شادی کیلئے کوششوں میں ہے اور یہ آگے پڑھائی کیلئے بضد ہے باتوں کی روانی میں اُسنے یہ بھی جان لیا تھا۔

مسز تہمینہ علی کو احمد یار گھرانے سے بھی شدید گلہ تھا کہ وہ آفتاب علی کے اتنے قریبی عزیز ہونے کے باوجود کتنے خشک لوگ ہیں۔ کبھی ملنے کی چاہت ہی نہیں کرتے۔ احمد یار پر بھی اعتراض ہوا کہ وہ تو لاہور میں ہی رہتا ہے کیا کبھی کبھار چکر نہیں لگا سکتا؟

احمد یار بس زیر لب مسکراتا رہا۔ کسی کسی بات کا مختصر سا جواب دیتا رہا۔ پھر ایک عمدہ سی چائے کے بعد اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''پروردگار ایسی اچھی اور پیاری لڑکیاں کیا ہمارے نصیب میں نہیں۔ کاش یہ لڑکی میری زندگی کی ساتھی ہو۔''

احمد یار کے دل میں لڑکی کھب گئی تھی۔ پر ازلی بزدل تھا۔ ایک دو بار دل میں آیا بھی کہ مسز تہمینہ علی کے پاس جاؤں تو سہی پر پھر رک گیا۔ بہت دنوں بعد گاؤں گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ اُسکی اور سلمان کی بات چیت کا سلسلہ ملتان کے کسی صاحب حیثیت گھر میں چل رہا ہے۔ احمد یار کیلئے جس لڑکی پر نظر ہے وہ ایم۔ ایس سی ہے۔ اور سلمان کیلئے لڑکی ڈاکٹر ہے۔

کہیں یہ وہی تو نہیں۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔ جب ماں اور بڑی بہن اُسے یہ تفصیل بتا رہی تھیں چھوٹی بہن کمرے سے دو تصویریں لیکر آ گئی۔ پوسٹ کارڈ سائز تصویر اسکے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

''یہ لڑکی ہے تمہارے لئے۔''

اسکی تصویر پر کیا نظر پڑی یوں جیسے زمین اپنے مدار پر بہت تیزی سے گھوم گئی۔ جیسے اُسے چکر آ گیا ہو۔

کندن کیطرح چمکتے چہرے والی لڑکی میٹھی سی نرم مسکراہٹ لئے اُس کے سامنے تھی۔ دعائیں اتنی جلدی قبول ہو سکتی ہیں۔ اور قدرت اتنی فیاض بھی ہو سکتی ہے کہ پل جھپکتے

میں خواہش پوری کردے۔ اسکا اُسے خاص تجربہ نہ تھا۔ پر اُس لمحے اُسکا مُومُو جیسے سراپا تشکر بن گیا۔

چونکہ طبعاً متین اور بُردبار طبیعت کا مالک تھا۔ بہنیں بھی پاس تھیں۔ اس لئے تصویر انہیں لوٹاتے ہوئے بولا۔

''جیسے مناسب سمجھو کرو۔''

احمد یار کو جیسے منزل مل گئی تھی۔ وہ مطمئن بھی تھا اور خوش بھی۔ بات تقریباً طے تھی۔ صرف شہریار کی لندن سے آمد کا انتظار تھا۔ خوابوں میں اکثر و بیشتر کندن جیسا چمکتا چہرہ نظر آتا۔ ایک دوبار اُسنے سوچا وہ مسز علی کیطرف جائے۔ پھر خیال آیا۔ نہیں رہنے دو۔ اس انتظار میں جو مزہ ہے اُسکی اپنی چاشنی ہے۔

انہی تصورات میں وہ عیدالفطر کی چھٹیوں میں گھر گیا تو وہاں پانسہ ہی پلٹا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ اُسکی دونوں بہنیں اسکی سُسرال گئی تھیں۔ وہاں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اب وہ اس بات پر تل گئی ہیں سوال ہی نہیں کہ وہاں رشتہ کیا جائے۔ احمد یار بہت پریشان ہوا۔ بہنوں سے معاملہ رفع دفع کرنے کیلئے کہا۔ بڑی کے لہجے میں رعد سی کڑ کی۔

''اُس کلموہی کی بیٹی کی ڈولی اس آنگن میں اُترے گی ممکن ہی نہیں۔ گھمنڈی عورت جانے کیا سمجھتی ہے خود کو۔ باپ بھی وہیں قریب بیٹھا حقے کے کش بھرتا تھا۔

''ٹھیک کہتی ہے زینب۔ اپنے آپکو بہت اعلیٰ وارفع خیال کرتے ہیں ارے میں کیا سمجھتا ہوں ایسے لوگوں کو۔ میرے بیٹے میرے قیمتی چیک ہیں۔ میں انہیں بہت اونچی جگہ بُھناؤں گا۔

باپ کی ایسی جاہلانہ اور احمقانہ بات کا وہ کیا جواب دیتا؟ ایسی فضول باتیں کرنے کا وہ ہمیشہ سے عادی تھا اور احمد یار سننے کا۔

اور جب احمد یار نے تنہائی میں ماں سے بات کی تو اُسنے گلوگیر سے لہجے میں کہا۔

''ارے بچے اب ان باپ بیٹیوں کو کون سمجھائے؟ کوئی پوچھے کہ اس میں تلملانے والی کونسی بات تھی۔ بھلا گھر میں مہمان آجائیں اور وہ مہمان اگر ضرورت کے تحت اندر بھی آجائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ اور پھر یہ لوگ کونسی پردہ نشین تھیں؟ اب اگر لڑکی کی ماں نے ان کی ایسی اوچھی باتوں پر کہہ دیا کہ بھئی تم لوگ گاؤں میں رہتی ہو۔ کھیتوں پر جاتی ہو۔ یوں بھی رشتہ ناطہ ہو جائے تو پھر پردے کیسے؟ میرے رشتے دار تمہارے اور تمہارے میرے۔ ٹھیک بات تو ہے۔ پر بچہ یہاں کون سچی بات کہے؟''

زینب بڑی ضدی اور جھگڑالو فطرت کی مالک تھی۔ شادی کے پہلے سال ہی رانڈ بن کر ماں کے دروازے پر آبیٹھی تھی۔ اب گھر میں اُسکی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔

رشتے توڑنے اور نئی نئی جگہ جانے اور بیٹوں کو پیش کرنے کا اُسکے باپ کو بھی شاید چسکہ پڑ گیا تھا۔ ماں نے البتہ منتیں کیں۔ برادری میں نکو بننے کا کہا۔ مگر وہ اڑیل ٹٹو کیطرح اکڑ گیا۔

''کسی کی مجال ہے جو میری بات کرے۔ میں طاقتور ہوں۔ پیسے والا ہوں۔''

اُسکے منہ لگنا احمد یار کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ گھر میں عجیب سی ٹینشن تھی۔ وہ تو اگلے ہی دن لاہور آگیا۔ آنے سے قبل نہ کسی سے ملا اور نہ کوئی بات کی۔ اسکا خیال تھا کہ سلمان سنگاپور سے آجائے تو پھر بات ہو۔ وہ اپنی بہن سے بھی بہت خوف زدہ تھا۔ بڑی چنڈال عورت تھی۔

احمد یار کی زندگی بھنور میں پھنسی کسی کشتی کی مانند ہوگئی تھی۔ روشنی کی وہ کرن جس نے اُسکے اندر باہر اُجالا سا کر دیا تھا ہمیشہ کیلئے ختم ہو رہی تھی۔ ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیر پھیل رہا

تھا۔وہ اکثر سوچتا اور خود سے کہتا۔

''کیا میں بزدل ہوں۔یا یہ میری سعادت مندی ہے کہ میں اپنی زندگی کے اس اہم مسئلے کو جسکا تعلق خالصتاً میرے مستقبل سے ہے خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔مگر ایک بات ضروری تھی۔اب وہ خاموش تماشائی نہیں رہنا چاہتا تھا۔''

پھر اُس نے ہمت کر کے باپ کو چٹھی لکھی۔

''میاں جی جب دو خاندان آپس میں ملتے ہیں تو کچھ چھوٹی موٹی باتوں کا ہونا فطری امر ہے۔فریقین پر واجب ہے کہ وہ صبر و تحمل سے ایک دوسرے کی فروگذاشتوں کو برداشت کریں اور جگ ہنسائی کا موقع نہ دیں۔آپ برادری میں ایک معزز فرد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔شادیاں اور منگنیاں کرنا اور پھر معمولی معمولی باتوں پر انہیں توڑ دینا آپکو زیب نہیں دیتا۔مہربانی فرما کر اس مسئلے پر نظر ثانی فرمایئے۔''

غلام مجتبٰے نے سارا خط پڑھا۔اُسکے پچاس پُرزے کئے۔چلم میں رکھے۔حقے کی نے منہ میں رکھی۔بھڑکتے شعلوں کو غور سے دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''بے وقوف کہیں کا۔مجھے پڑھانے چلا ہے۔مجھے جو اس جیسے ہزار افسروں کو پڑھا دے۔سچ کہا ہے کسی نے یہ پڑے لکھے لوگ اپنی جگہ سے ذرا سر کے ہوتے ہیں۔''

ابھی وہ سلمان کی واپسی کے انتظار میں تھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔وہ آفس سے آیا تو باپ بہنیں اور چھوٹا بھائی سب گھر میں موجود تھے۔اُسکی حیرت زدہ آنکھوں سے ابھی کوئی سوال نکل کر اُسکے ہونٹوں پر نہیں آیا تھا جب اُسکے باپ نے خوشی سے چہکتی آواز میں اُسے ایک بڑے اونچے گھر میں انتہائی خوبصورت لڑکی سے اسکی منگنی اور شادی کی نوید سُنا دی۔

''ارے بیٹا دیکھو ایسا گھر گھرانہ ایسی خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکی مقدر والوں کو ملتی

ہے۔بس اب ہتھیلی پر سرسوں اُگے گی ۔بات پکی اور شادی کی تاریخ طے۔"

وہ تو گم سم حیرت زدہ سا انہیں دیکھتا رہ گیا کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ اگلے ہفتے شادی ہے۔نہ انہیں سلمان کا انتظار تھا نہ انہیں شہریار کے شامل کرنے کا خیال تھا۔

باپ بولے چلے جارہا تھا ۔اور اُسکی سماعتوں میں آندھیاں سی چل رہی تھیں ۔اگلے تین دن انہوں نے خریداریوں میں گزارے اور چوتھے دن اُسے ساتھ لیکر گاؤں روانہ ہوگئے ۔

اُسنے بھی جیسے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔

بارات کا استقبال انتہائی شاندار تھا۔پڑھے لکھے لوگ نظر آتے تھے کو دولت اور اسکی نمائش کا بھرپور اظہار تھا پر عامیانہ پن کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

اسکی واپسی دُلہن کے ساتھ جلدی ہوگئی تھی ۔باپ بہنیں جہیز لانے کیلئے رک گئے تھے۔گھر میں ماں پھوپھی نے استقبال کیا اور دونوں کو انکے کمرے میں پہنچا دیا۔

اُسنے دُلہن کو دیکھا تو کنگ سا رہ گیا۔کہاں وہ چاند چہرہ اور کہاں یہ گہنایا سا رنگ روپ۔نقش بھی کچھ خاص نہ تھے۔اور عمر بھی ستائیس اٹھائیس سے ہرگز کم نہ تھی ۔

اُسنے لمبی سانس کھینچی اور دل میں کہا۔

"یہی ہونا تھا۔"

اگلی صبح جب وہ آنگن میں آیا۔ایک نیا منظر اُسکے سامنے تھا۔اُسکی دونوں بہنیں اور باپ برآمدے میں کبھی چارپائی پر بیٹھتے اور کبھی اُٹھ کر چکر کاٹنے لگتے۔

اُس پر نظر پڑتے ہی اُسکا باپ شعلہ بار نگاہوں سے چلّایا۔

"اتنا بڑا دھوکہ؟ اتنا فراڈ؟ ارے لڑکی دکھائی کوئی اور بیاہ ہی کوئی۔اور جہیز دیکھو یہ چند چیزیں۔نہ میری بیٹیوں کو کوئی کپڑا لتّا نہ زیور کا کوئی چھلا ۔نہ تمہاری ماں پھوپھی کو کچھ۔"

احمد یار کھڑا ابٹر بٹر باپ کے پھنکارے مارتے چہرے کو دیکھتا تھا۔ایکا ایکی وہ اسکی طرف مڑا اور گرجتے ہوئے بولا۔

طلاق دو۔ابھی طلاق دو۔میں ان لوگوں کو دھوکہ دینے کا مزہ چکھا دوں گا۔

''ارے نہیں ابا جی آپ نے اپنے قیمتی چیک کو کوڑیوں کے عوض گنوا لیا ہے۔''

دل کا راستہ

گاڑی کے ہارن کی چیختی چنگھاڑتی آواز اس بات کا واضح اعلان تھی کہ اُس کا شوہر دفتر سے گھر آ گیا ہے اور بس اب کوئی دم میں اندر آیا چاہتا ہے۔ نوکر نے گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی پورچ میں آ کر رُک گئی تھی۔ گھر کے عقبی لان میں مخملیں گھاس پر ٹرائی سائیکلوں پر کھیلتے اُس کے تینوں بچے جو ایک دوسرے سے کسی معمولی بات پر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اس آواز پر اپنا لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ''پپا آ گئے۔ پپا آ گئے'' چلاتے شور مچاتے کار پورچ میں آ کر رُک گئے تھے۔ اُن کے ہنستے مسکراتے چہرے ،اُن کی مضطرب بانہیں باپ کو خوش آمدید کہنے، اُسے پیار کرنے اور اپنی ننھی منی بانہوں میں سمیٹنے کو مضطرب تھیں۔

''پاپا مجھے اُٹھایئے۔ پپا مجھے'' جیسی من موہنی آوازوں کی صدا سارے گھر میں پھیل گئی تھی۔ وہ ہشاش بشاش گاڑی سے اُترا۔ اُس کا چہرہ تھکاوٹ کے باوجود کھلا ہوا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند کر کے وہ اُن کی طرف بڑھا۔ اپنے اوپر کے نصف وجود کو نیم خمیدہ کرتے ہوئے اُس نے تینوں کو اپنے کلاوے میں بھر لیا۔ اُن کے رخساروں اور گردنوں پر پیار بھرے بوسوں کی بارش کرتے ہوئے اُس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

''شیطانو، یہ کیا کر رہے تھے تم لوگ؟''

''پپا۔ ڈولی مٹی سے کھیل رہی تھی۔ دیکھئے نا اُس نے اپنے کپڑے کتنے گندے کر

لئے ہیں؟'' ضائم نے چھوٹی بہن کی........شکایت کی۔

''پپا۔بھیّا نے مجھے مارا ہے۔'' ننھی مُنّی ڈولی نے مُنہ بسورا۔

اُس نے اوون کے چوتھے چولھے کو دیا سلائی دکھا کر جلایا اور اُس پر توا چڑھا دیا۔تینوں چولہوں پر مختلف چیزیں دم پر تھیں۔توے کو گرم ہونے کا وقت دینے کے لیے وہ خود برآمدے میں باپ بچوں کے ملاپ کے نظارے سے محظوظ ہونے کے لئے آکھڑی ہوئی تھی۔ہر روز کم وبیش یہی منظر تھوڑے سے فرق سے دہرایا جاتا۔بچے شور کرتے ہوئے بھاگتے۔گاڑی رُکتی، دروازہ کھلتا، وہ ہنستا مسکراتا باہر نکلتا۔بچے باپ کی ٹانگوں سے لپٹتے یا اُس کی گود میں چڑھنے کے لئے ضد کرتے اور وہ اُنھیں بانہوں میں سمیٹے گردن پر بٹھائے یا اُن کی انگلیاں پکڑے اُن کے آگے پیچھے اندر داخل ہوتا۔اس منظر میں اتنی آسودگی، اتنی طمانیت اور اتنی خوبصورتی ہوتی کہ بار بار دُہرائے جانے کے باوجود بھی اُس کی چاشنی کم نہ ہوتی۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔باپ کے ساتھ بچے بھی اندر آگئے تھے۔اُس نے اُنھیں خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو اب ہاتھ دھوؤ۔کھانا کھاتے ہیں۔میں تب تک چینج کر آؤں۔''

''پپا۔مما نے کباب بنائے ہیں۔فنگر چپس تلے ہیں۔'' ضائم نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

''واہ کیا کہنے ہیں،تمہاری مما کے۔چلو شاباش ہاتھ منہ دھو کر آجاؤ تم لوگ۔''

''ہاں پپا کھیر بھی بنی ہے۔'' ضائم نے پھر آنکھیں نچائیں۔

''تو آج بڑا کھانا ہوگا۔'' وہ ہنستے ہوئے لباس تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اور پھر کھانے کی میز پر عجیب سی بات ہوگئی ۔اُس نے پلکیں جھپکا کر دو تین بار غور سے شوہر کو دیکھا اور بولی ۔

''محسن، آپ کو ایسی باتوں پر توجہ دینے کا خیال کیسے آ گیا ؟''

واقعہ یہ تھا کہ وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد کچن میں آیا ۔اُس وقت وہ پُھلکے بنا رہی تھی ۔برقی انداز میں اُس کے ہاتھ کام کر رہے تھے ۔بھاپ سے پھولے پھولے گول گول سے پُھلکے ہاٹ پوٹ میں رکھتے رکھتے اُس نے رُخ پھیر کر اُسے دیکھا اور کسی قدر گھبرا کر بولی ۔

'' آپ میز پر چل کر بیٹھیئے ۔میں بس کھانا لگانے والی ہوں ۔یہاں بہت گرمی ہے ۔''

''کیا ہوا؟ تم بھی تو اسی گرمی میں کھڑی ہو ۔''

وہ وہیں اُس کے پاس کھڑا رہا ۔بیوی کو اُس نے بغور دیکھا ۔بائیں ہاتھ سے اُس کے رُوکھے اور چمک سے عاری بالوں کی چند بھیگی لٹوں کو چھوا اور بولا ۔

''ثمینہ تم انھیں شیمپو نہیں کرتیں ۔یہ کیسے عجیب سے ہو رہے ہیں؟ پھیکے اور رُوکھے رُوکھے ۔'' پھر اُس نے اُس کے سراپے پر بھی ایک بھرپور نظر ڈالی ۔خفیف سا مسکرایا اور بولا ۔

''تم اپنے آپ سے اتنی لاپروا کیوں ہوتی جا رہی ہو؟ بہت دنوں سے یہی جوڑا میں تمہارے بدن پر دیکھ رہا ہوں ۔لگتا ہے اسے ہی دھو کر پھر پہن لیتی ہو ۔

اُس وقت شاید اُس کا ذہن کھانے میں اُلجھا ہوتھا ۔

'چلیئے چلیئے ۔'' کہتے ہوئے اُس نے اُسے اپنے آگے دھکیل دیا ۔

میز پر ساری چیزیں نوکر کی مدد سے لگوا کر جب وہ بیٹھی تو جیسے اُس کے ذہن کی بند

کھڑکی کُھل جانے والا معاملہ ہوا ہو۔اُس نے حیرت سے شوہر کو دیکھا اور کسی قدر طنز سے کہا۔

''آج آپ کو میرے بالوں اور کپڑوں کا خیال کیسے آگیا؟ دل کے کونوں کھدروں میں سوئی ہوئی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی ہے یا کوئی اور بات ہے بتایئے؟''

وہ خفیف سا ہو گیا۔خجل سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''بس تم عورتوں کی بھی عجیب عادتیں ہیں۔خیال کرو تب بھی اعتراض، نہ کرو تب بھی اعتراض۔بندہ کہاں جائے اور کیا کرے؟''

''جب خلافِ معمول کوئی بات ہو تب کُرید تو پیدا ہوتی ہے۔تجسّس سا جنم لیتا ہے۔ذہن سوالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔یہ فطری امر ہے۔''اُس نے پلیٹ میں نوکر کے لیے کھانا نکالتے ہوئے کہا۔

کھانے کے دوران اور بعد میں اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی۔لیکن اُس دن سونے کے وقت تک اُس کے ذہن میں یہ بات برابر کھٹکتی رہی کہ آج محسن کے دل و دماغ میں یہ خیال کیسے آیا؟ اُس نے میرے کپڑوں اور بالوں کے بارے میں کیوں کہا؟ اندرونی سوچوں سے اُس کی بھنویں سکوتی اور پھیلتی رہیں۔

پیشانی پر خفیف سی لکیریں بنتی اور مٹتی رہیں۔دل میں اُتھل پتھل سی ہوتی رہی۔کیوں اور کیسے کے زہریلے سپنولیے خواہ مخواہ اپنا زہر ذہن میں بھرتے رہے۔دماغ کو زہر آلودہ کرتے رہے۔دل شبہات کی گھمن گھیریوں میں اُلجھا رہا۔پر رات کو جب وہ بستر پر سونے کے لئے لیٹی تو اُس نے سر جھٹک دیا۔اپنے آپ سے کہا۔

''ساتھ رہنے والوں کے کوئی دانت تھوڑی گنتے ہیں۔وہ تو جانے بوجھے اور سمجھے سمجھاتے ہوتے ہیں۔ایسے ہی خیال آگیا ہوگا۔میں بھی تو عجیب سی ہوں۔خود سے اتنی

لاپروا ہوگئی ہوں۔کوئی بھلا ایسے بھی کرتا ہے۔ دنوں نہ نہاؤں۔دنوں کپڑے نہ بدلوں۔مجال ہے کہ کبھی ہونٹوں پرلپ اسٹک کاہلکا ساٹچ بھی دیا ہو۔مجال ہے کہ کبھی بال نئے انداز سےسنوارے ہوں۔عورتیں کہیں فیشل کرواتی ہیں ،کہیں تھریڈنگ کے لئے بھاگی جارہی ہیں۔میں تو گویا دنیا سے کٹی اس چاردیواری میں قیدہوکررہ گئی ہوں۔

....

کینیا کی آغاخانی زرتاج بیگم اُسے جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔بن غازی کا سکندررضا بھی اُس کے ساتھ تھا۔وہ ہال میں اُس کی عیادت کے لئے آئے تھے۔زرتاج بیگم کوپچھلے دنوں یرقان ہوگیا تھا۔کافی دن ہسپتال میں داخل رہی۔

دوتین چکراُس نے ہسپتال کے بھی لگائے۔آج یہ جاننے پر کہ وہ ہوسٹل آگئی ہے،وہ اُسے دیکھنے ہال چلی آئی تھی۔زرتاج سخت ڈپریشن کاشکارتھی۔ایک پردیس دوسرے بیماری۔وہ اُسے اُٹھنےنہیں دے رہی تھی۔

''ثمینہ ڈارلنگ ،اتنی جلدی جا رہی ہو۔ابھی تو تمہیں آئے گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔دیکھو، میں بہت اُداس ہوں۔مجھے ہوم سکنس ہورہی ہے۔

''جانی ،پاکستانی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی آج میٹنگ ہے،مجھے اُس میں ضرور شامل ہونا ہے۔ہماری فیڈریشن کے پریذیڈنٹ نے مجھے تاکید کی تھی۔اُسے مجھ سے بہت گلہ رہتا ہے کہ میں اپنی کمیونٹی کےلوگوں سے گھلتی ملتی نہیں۔اُن کے مسائل کوشیئرنہیں کرتی ہوں۔آج کااجلاس بہت اہم ہے۔کچھ نئے پاکستانی آئے ہیں،اُن سےبھی متعارف ہونا ہے۔میں انشاءاللہ پھرچکرلگاؤں گی۔ہاں سکندرتمہارے پاس ہےتمہارا دل بہلائے گا۔''

اُس نے زرتاج کے دائیں گال پرکِس کیا۔لبوں پرمسکراہٹ بکھیری۔دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے اوربولی۔

''ہماری زرتاج بہت بہادر ہے۔'' اور رباٗئی بائی کرتی کمرے سے نکل گئی۔

وہ ہال سے نکل کر بگٹٹ بھاگی۔ٹی۔ایس۔سی سنیٹر میں خاصا رش تھا۔ہجوم سے بچتی بچاتی وہ ہال کمرے میں داخل ہوئی۔اجلاس شروع تھا۔وہ پچھلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔تیز تیز چلنے کی وجہ سے سانس قابو میں نہ تھا۔سردی کے باوجود چہرہ پسینے سے کسی قدر بھیگا بھیگا سا تھا۔اُس نے بیگ سے ٹشو پیپر نکال کر پسینہ پونچھا۔سانس ذرا درست ہوئی تو اُس نے تنقیدی نگاہ دائیں بائیں اور سامنے دوڑائی۔ڈائس پر چند نئے لوگ نظروں کی زد میں آئے۔پتا نہیں پاکستان کے کس کس شہر کے تھے شاید کوئی لاہور سے بھی ہو۔وطن میں رہتے ہوئے وطن کی محبت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔مگر جوں ہی بندہ اس حصار سے باہر نکلتا ہے، سوئی ہوئی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے۔پیار کے سوتے جیسے اُبل پڑتے ہیں۔دل اُس کے ذرّے ذرّے کے بوسے لینا چاہتا ہے۔دریا میں طغیانی والا حال ہوتا ہے۔محبت کا سیلاب شراٹے مارتا کناروں سے باہر بہنے لگتا ہے۔انسان چھوڑ جانور بھی اچھے لگتے ہیں کہ اُن کی نسبت اگر اس زمین سے ہے۔

ایسوسی ایشن کا صدر پاکستانی اسٹوڈنٹس پر یہ واضح کر رہا تھا کہ وہ اپنے ملک کے سفیر ہیں۔اُنھیں ہر وہ کام کرنا ہے جس سے ملک کی نیک نامی ہو۔

اور جب سارے لوگ چائے کے لئے جا رہے تھے، نئے طلباء فرداً فرداً اُس کے پاس آئے اور اُس سے متعارف ہوئے۔اِن نئے لوگوں کے ساتھ اپنے قدم اُٹھاتے اُٹھاتے اُس نے ایک اور نوجوان کو دیکھا۔یقیناً وہ بھی پاکستانی تھا۔اسٹیج پر اُسے بھی بُلا کر متعارف کروایا گیا تھا۔دلکش خدوخال، گندمی رنگ اور اونچا لمبا قد۔متاثر کن شخصیت تھی۔نام محسن ممتاز تھا۔گوجرانولہ کا رہنے والا اور کیمیکل ٹیکنالوجی میں آنرز کے بعد اب امریکن یونیورسٹی بیروت میں آیا تھا۔

بڑا بد دماغ اور مغرور سا نظر آیا تھا۔مزے سے چائے پینے اور چیزیں کھانے میں جتا رہا۔نہ کسی کی طرف توجہ کی اور نہ کسی اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔لڑکوں سے تو پھر بھی بات چیت کرتا رہا۔پر لڑکیوں کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ کی۔لڑکیاں تھیں بھی کتنی ؟تھوڑی سی صرف پانچ۔زعیمہ جو میڈیکل کر رہی تھی۔نورین لٹریچر میں آنرز کی اسٹوڈنٹ تھی۔سعدیہ پاکستانی سفارت خانے کے پریس اتاشی کی بیٹی تھی۔ایک وہ خود تھی۔پانچویں لڑکی زہرا پاکستانی نژاد تھی، پر طویل عرصے سے لبنان میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھی۔پاکستانی طلباء یہاں ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے۔ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک، ہمدرد اور غمگسار۔

اسکیٹنگ کے لئے جاتے ہوئے اُس کا گزر اُس کے ہال کے سامنے سے ہوتا تو کبھی کبھی ٹکراؤ بھی ہو جاتا۔شروع شروع میں تو بہت بے نیازی سے آگے بڑھ جاتی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ علیک سلیک ہونے لگی بلکہ کسی دن ہلکی پھلکی بات بھی ہو جاتی تب اُسے احساس ہوا کہ وہ مغرور اور بد دماغ نہیں۔سادہ اور مخلص سا نوجوان ہے۔پورے کیمپس میں وہ واحد انسان تھا جس کے بال ذرا سا بڑھنے پر باربر کے پاس پہنچنے کے لیے بے تاب ہو جاتے۔کپڑے بھی بالعموم ایک ہی رنگ کے پہنتا۔ایک دوبار اُس نے سوچا بھی۔

''ارے یہ کہیں کلر بلائنڈ تو نہیں۔''

مگر یہ شک بھی دُور ہو گیا۔

ہوا یوں کہ وہ بیروت ریڈیو اسٹیشن سے یونیورسٹی پروگرام کر کے نکلی۔شام بڑی دلکش تھی۔اس اتنی خوبصورت شام کو سراہتے ہوئے اُس نے سواری کی تلاش میں نظریں سڑک پر اِدھر اُدھر دوڑائیں۔جب محسن ممتاز ٹیکسی میں بیٹھا اُس کے پاس آکر رُکا۔اُس نے دروازہ کھولا اور اُس کے قریب آکر متانت سے بولا۔

''ہمارے ایک فیملی فرینڈ بزنس ٹور پر یہاں آئے ہوئے تھے۔وہ واپس جا رہے

ہیں۔میں اُن کے ہاتھ اپنی والدہ اور چھوٹے بھائیوں کے لیے کچھ بھیجنا چاہتا ہوں۔مہربانی ہوگی اگر آپ میرے ساتھ مل کر اُنکے لئے شاپنگ کروانے میں میری کچھ مدد کردیں۔''

وہ بغیر کسی پس وپیش کے اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔درخواست جس لب و لہجے میں کی گئی تھی، اُس میں اتنی معصومیت اور بھولا پن تھا کہ اُسے بہت اچھا لگا۔مارکیٹ میں گھومتے پھرتے خریداری کرتے اُسے احساس ہوا تھا کہ چیزوں کی سلیکشن میں اُس کی پسند بہت اچھی ہے۔

دیر تک وہ مارکیٹ میں گھومتے رہے۔کھانا بھی وہیں کھایا۔باتیں بھی خوب کیں۔اُسے محسن ممتاز بہت اچھا لگا۔اُس کی معیت میں اُس نے اپنے آپ کو اہم سمجھا۔

یوں اُن کے درمیان خفیف سا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔جسے زبان دینے کو دونوں نے اپنی توہین سمجھا۔

اُس کی آخری ٹرم ختم ہوئی۔کمپری ہینسو ٹیسٹ سے وہ فارغ ہوگئی تھی۔تھیسس سے بھی نجات مل گئی۔اور جس دن وہ بیروت ایئر پورٹ پر وطن واپسی کے لئے پی آئی اے کا ٹکٹ حاصل کرنے گئی، اُسے فیروز جان وہاں ویٹنگ لاؤنج میں نظر آیا جس نے اُسے دیکھتے ہی شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا وہ نہیں جانتی کہ محسن ممتاز کو اپنڈ یکس کا شدید درد اُٹھا ہے؟ گھنٹہ بھر پہلے اُسے ہسپتال پہنچایا گیا ہے اور اب شاید اُس کا آپریشن ہو رہا ہو۔

وہ تو دھک سے رہ گئی۔کہاں کا ٹکٹ اور کہاں کی واپسی؟ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچی۔آپریشن تھیٹر کے باہر لڑکے اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔وہ ابھی تک اندر ہی تھا۔کوئی دو گھنٹے بعد اُسے آئی۔سی۔یو میں لایا گیا۔اُس کی بُری حالت تھی۔چہرے کا رنگ فق اور ہونٹ سفید پڑے تھے۔آپریشن بہر حال ٹھیک ٹھاک ہوگیا تھا۔اُس کی تیمارداری کا سارا بوجھ اُس نے اپنے سر پر اُٹھالیا۔

وقت پر دوا وقت پر کھانا۔ پردیس میں مضبوط سے مضبوط اعصاب والا آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ مگر اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محسن بہت حوصلے والا آدمی ہے۔ مجاہد قسم کا بڑے دل گردے والا۔ دو ایک بار اُس نے کہا بھی۔

''میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ شکر گزاری کے یہ الفاظ اور اظہار میرے جذبات کی عکاسی کے لیے بہت نا کافی ہیں۔ دراصل میں بہت کم گو قسم کا انسان ہوں۔ زیادہ باتوں کی عادت نہیں۔''

اُس نے بہت گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ اور کہے۔ کوئی ایسی بات جو یہ واضح کرے کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اُسے اپنی جیون ساتھی بنانے کا خواہشمند ہے۔ مگر وہاں خاموشی تھی۔ آنکھیں کچھ اظہار کرتی تھیں مگر ہونٹ خاموش تھے۔

تب اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں کہیں ریت کا گھروندا تو نہیں بنا رہی ہوں۔ ناپائدار جو ایک ہی جھٹکے سے ڈھے جائے۔''

اُس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ انگلیوں کی پوروں سے اُس نے اُنھیں خشک کیا اور خود سے کہا۔

''ضروری نہیں کہ انسان کی ہر آرزو پوری ہو۔''

اُس نے پھر رختِ سفر باندھا۔ ٹکٹ خریدا اور ایک دن جب وہ تنہا بحیرہ روم کے ساحل پر گھنٹہ بھر گزار کر ہال واپس آئی اور فرنٹ کوریڈور میں چُپ چاپ کھڑی کیمپس کے در و دیوار اُس کی پُرشکوہ عمارات اور گھاس کے سرسبز قطعوں پر دکھ بھری الوداعی نظریں ڈال رہی تھی کہ اُس نے محسن ممتاز کو دیکھا جو ریسپشن روم کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ اُداسی کے رنگ لیے آنکھوں سے اُسے دیکھتا ہوا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

''محسن آؤ کیسے ہو؟'' وہ آگے بڑھی۔ہال کے غربی لان میں سنگی بنچ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے پہلے فضا کے حُسن کو دیکھا،پھر اُس پرنظریں جمائیں۔

''ثمینہ سمجھ میں نہیں آتا میں بات کیسے شروع کروں اور کیا کہوں؟''

ثمینہ کومحسوس ہورہا تھا کہ اُس کی آواز جذبات سے بوجھل اوراُس میں احساسات کی تپش ہے۔

''دراصل لڑکیوں سے بات کرنے میں مجھے ہمیشہ کچھ ہچکچاہٹ اور جھجک سی رہی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اپنے گھر کے ماحول میں صرف اپنی ماں ہی کو دیکھا۔ میری کوئی بہن نہیں۔کزن لڑکیوں سے بھی ہمارا بہت کم واسطہ رہا۔شادی بیاہ کی تقریبات میں ہمارے والدین کبھی ہمیں لے کر نہیں گئے۔ہماری تعلیم کا اُنھیں ہمیشہ خیال رہا۔''

وہ رُک گیا تھا۔ثمینہ خاموش بیٹھی دھڑکتے دل سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔کیا کہنا چاہتا ہے وہ؟ کیا وہ اُسے پسند ہے؟ کیا وہ اُسے اپنانا چاہتا ہے؟یا اُس کی منگنی وغیرہ کہیں ہو چکی ہے۔پتا نہیں وہ اُسے کیا بتانا اور کیا سنانے کا متمنی تھا؟

اللہ کیسے جانکسل لمحات ہیں جیسے وہ کسی پُل صراط پر کھڑی ہو۔

''ثمینہ۔''اُس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سلسلہ گفتگو کو دوبارا جوڑا۔

''ایک چھوٹی سی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کی کہیں کوئی وابستگی نہ ہوتو وطن واپس جا کر میرا انتظار کریں۔''

سارے سرپر میں جیسے جذبات کا بھونچال آجانے والی بات ہوئی تھی۔اُس کی پلکیں بھیگ سی گئیں۔کچھ کہے بغیر اُس نے محسن ممتاز کا ہاتھ پکڑا۔اپنے دونوں ہاتھوں میں اُسے تھاما،اور بھیگی آواز میں بولی۔

''محسن، میں تمہارا انتظار زندگی بھر کر سکتی ہوں۔''

اُس نے ہاتھ چھوڑ دیے، کھڑی ہوئی اور بغیر اُس کی طرف دیکھے اپنے راستے پر بڑھ گئی۔

محسن کے اس اظہاریئے کو اُس نے تہہ دل سے پسند کیا۔ اُس نے محبت کے لمبے چوڑے دعوے نہیں کیے بلکہ سیدھی سادی بات میں مدعا اُس کے گوش گزار کر دیا۔

اس واقعے کے پورے دو سال بعد محسن ممتاز کے والدین اُس کے گھر آئے۔ یوں وہ اُس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ شب عروسی اُس نے شاکی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت عجیب ہو محسن تم۔ کبھی دو پیسے کا خط بھی نہیں لکھا۔''

''میں نے نہیں لکھا تو تم نے کون سا لکھ دیا۔'' وہ ہنسا۔

''میں کیوں لکھتی؟'' ثمینہ غرائی۔

''اس ملاپ میں زیادہ لطف نہیں۔''

''دو سال کیسے گزارے؟ اُمید و بیم کی پُر پیچ وادیوں میں بھٹکتے ہوئے۔'' ثمینہ سسک اٹھی۔

''چلو جان معاف کر دو۔ محسن نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ اور بولا۔''

عجیب سی فطرت ہے میری۔ جذبات کے اظہار کو زبان دینا مجھے عامیانہ سا لگتا ہے۔ خط لکھنا اور بھی مشکل ہے۔ یہ تھوڑی کہ میں نے تمہیں خط نہیں لکھے۔ بے شمار لکھے پر سب لکھ کر پھاڑ دیے۔ کبھی پوسٹ کرنے چلا بھی جاتا پھر واپس لے آتا۔ بس جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔''

عملی زندگی میں داخل ہو کر اُسے احساس ہوا کہ وہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ

کافی آرام طلب بھی ہے۔دفتر جانے سے پہلے اُس کی ہر چیز تیار ہونی چاہیے تھی۔گھر کی کسی ذمے داری سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ملازمت عمدہ اور تنخواہ معقول تھی۔وہ مناسب حصّہ گھروالوں کو بھیج کر باقی سب کچھ اُسے تھما دیتا۔وہ بچائے یا ساری خرچ کرے،اُس نے اس بارے میں کبھی کوئی سوال و جواب نہیں کیا تھا۔

ایک دوبار دبے دبے لفظوں میں اُسے کہا بھی کہ آخر اتنے روپے والدین کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ خاصے متمول بھی ہیں اور دوسرے کسی لڑکی کی بھی کوئی ذمے داری نہیں۔

اُس نے رسان سے کہا۔’’اس مسئلے پر دوبارہ گفتگو ہمارے درمیان تلخی کا باعث بن سکتی ہے۔جان لو کہ یہ میرا فرض ہے۔‘‘

اُس نے ملازمت جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

’’دیکھو جان،میں اچھے کھانوں کا بہت دلداہ ہوں۔قدرے سُست بھی ہوں۔دفتری مغز کھپائی اور فلیڈ کے کام کے بعد گھریلو کاموں میں تمہارا ہاتھ نہیں بٹا سکوں گا پھر تمہیں اعتراض ہوگا کہ میں خودغرض اور لاپروا ہوں۔بس اس سلسلے کو ختم ہی کردو تو بہتر ہے۔‘‘

وہ فطرتاً سادگی پسند تھی۔شوہر بھی اُسی مزاج کا ملا۔فوراً ہی ماں بھی بن گئی۔اوپر تلے بچے بھی ہو گئے۔طبیعت ایسی درہم برہم ہوئی کہ اچھا پہننے،اوڑھنے کا شوق ہی جاتا رہا۔دودودن کپڑے نہ بدلتی۔بال تک ڈھنگ سے نہ سنوارتی۔اردگرد کے گھروں کی فیشن ایبل موڈرن عورتیں اکثروبیشتر کہتیں۔

’’بڑی سٹوپڈ ہو،کچھ اپنا خیال رکھا کرو۔شوہر کے آنے سے پہلے بن سنور کر رہا کرو۔اپنے آپ سے اتنی لاپروائی اچھی نہیں۔مردذات پر اتنا اندھا بھروسا درست نہیں۔‘‘

وہ ہنس دیتی اور پھر اطمینان سے کہتی ۔

''تم لوگ میرے شوہر کو نہیں جانتیں ۔ اُسے تام جھام سے چڑ ہے ۔''

''کمال ہے یار ۔ تم اس صنف کی نفسیات نہیں سمجھتیں ۔ ارے باہر رنگ برنگی تتلیاں دیکھتے ہیں ۔ گھر آتے ہیں تو بیویاں سر جھاڑ منہ پھاڑ ملتی ہیں ۔ دھیرے دھیرے متنفر ہو جاتے ہیں ۔ باہر دوستیاں اور یارانے گانٹھ لیتے ہیں ۔ یوں بستے رستے گھر اُجڑ جاتے ہیں ۔'' کوئی جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ۔

وہ رات کو ہنس ہنس کر محسن کو یہ سب سُناتی ۔ اور وہ کہتا ۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ محبت ان سہاروں کی محتاج نہیں ہوتی ۔''

اوپر تلے تین بچے ہو گئے ۔ وہ گھر داری میں پوری طرح اُلجھ گئی ۔ ذرا سی فراغت ملتی تو باورچی خانے میں گھس جاتی اور پکوان پکانے میں جُت جاتی ۔ محسن اُس کی کوکنگ کا مداح تھا لیکن کبھی کبھی اُسے شدت سے احساس ہوتا کہ وہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئی ہے ۔ زیادہ غصہ آتا تو محسن پر بھی بگڑ بیٹھتی ۔ اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتی ۔

''تمہیں کیا ؟ تمہیں تو صرف اپنے آرام سے مطلب ہے ۔ تم نے کبھی پوچھا کہ میرے پاس پہننے کے لیے کپڑے ہیں یا نہیں ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی ہے ۔ بس تم اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا جانتے ہو ۔''

وہ ہنس پڑتا ۔ اُسے شانوں سے تھام کر اپنے قریب کرتا اور کہتا ۔

''کمال ہے یار ، مجھے بتاؤ ۔ میرے لیے خریداری کون کرتا ہے ؟ تم کرتی ہو نا ۔'' وہ اُس کی آنکھوں پر اپنی انگلیوں سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اشارے دیتا ۔ ''سلائی کے لیے درزی کو کون دے کر آتا ہے تم نا ۔'' وہ اُس کے کندھے ہلاتا ۔

''میرے لیے جوتے بھی تم لاتی ہو نا ۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

پوچھتا۔اب بتاؤ جب میں اپنے لیے کچھ نہیں کرتا تو تمہارے لیے کیا کروں گا؟اپنے لئے شاپنگ کیوں نہیں کرتی ہو؟کسی نے کبھی تمہیں روکا،کبھی تمہارا ہاتھ پکڑا۔بولو۔بتاؤ۔''

وہ روٹھی ہو جاتی۔''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے محسن۔''

''اچھا تو چلو، میں تمہارے لیے خریداری کرتا ہوں۔لیکن پھر نہ کہنا کہ فلاں چیز مہنگی آ گئی ہے۔یہ رنگ موزوں نہیں ہے۔جولاؤں رکھنا پڑے گا،نہیں تو میرے ساتھ چلو۔''

وہ چپ ہو جاتی۔اُس کی طبیعت کو جانتی تھی۔خرچ کرنے پر آتا تو اگلا پچھلا حساب برابر کر دیتا۔

ایک روز باتوں باتوں میں اُس نے بتایا کہ دفتر میں کچھ لڑکیاں کیمیکل انجینئرز کے طور پر سلیکٹ ہو کر آئی ہیں۔ہمارے ونگ میں چار لڑکیاں آ گئی ہیں۔''

''چلو تمہاری کچھ جھجک تو دور ہوگی۔''وہ خوش دلی سے ہنسی۔''عورت دیکھتے ہو تو دس کوس پرے بھاگ جاتے ہو۔''

انہی دنوں فرم کی طرف سے اُسے ایک ماہ کے لیے آسٹریلیا بھیجا جا رہا تھا۔ثمینہ نے اُسے کچھ متفکر سا پایا تو بولی۔

''کیا بات ہے جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

وہ متذبذب میں ڈوبا بولا۔

''دراصل نئی جگہ اور نئے حالات میں ایڈجسٹمنٹ کا تھوڑا سا مسئلہ تو ہوتا ہے مگر اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مس رفیعہ دُرّانی ساتھ جا رہی ہیں۔تمہیں تو میری عادت کا علم ہے۔عورتوں کے معاملے میں نرا گاؤدی ہوں۔اپنی کیٹس کا خیال نہیں رہتا۔''

''چلو ہٹو ناحق پریشان ہو رہے ہو۔تمہیں کیا وہ کھا جائے گی؟''

اُس نے ہنستے مسکراتے اُسے رخصت کیا۔''فون پر ہی نہ ٹرخانا۔خط بھی لکھنا۔خط

کا ایک اپنا مزہ ہے ۔اور ہاں، پہلے کی طرح نہ کرنا ۔وگرنہ بچوں سمیت تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی ۔''

اُس کی عدم موجودگی کو اُس نے محسوس تو کیا مگر اس حد تک نہیں ۔گھر لاک کر کے وہ والدین کے پاس آ گئی ۔پُرانی سہیلیوں سے ملی ۔عزیزوں رشتے داروں سے جی بھر کر باتیں کیں ۔پُرسکون ہو کر مہمان بنی اور پکا پکایا کھایا ۔گھر داری اور خرچ وغیرہ کے چکروں سے چند دنوں کے لیے آزادی ہو گئی اور یہ آزادی اُسے بہت اچھی لگی ۔

پندرہ بیس دن بہت لطف سے گزارے ۔پھر وہ اُداس سی ہو گئی ۔محسن اُسے یاد آنے لگا ۔اس جدائی کی کسک ابھی اپنے عروج پر نہ پہنچی تھی کہ وہ آ گیا ۔ایک ماہ کے لیے تو گیا تھا ۔زندگی پھر روٹین پر شروع ہو گئی ۔

اور پھر اُس دن عجیب سی بات ہو گئی ۔اُس نے ثمینہ کے بالوں کی لٹ چُھو کر کہا ۔

''تم انھیں شیمپو نہیں کرتیں ۔یہ کیسے رُوکھے رُوکھے اور عجیب سے ہو رہے ہیں ۔''

اور ثمینہ کا دل وسوسوں اور اندیشوں کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا رہا ۔اُس کے اندر اُتھل پتھل ہوتی رہی ۔بہت سے اُلٹے سیدھے، خیالات پریشان کرتے رہے ۔

ایک دن وہ اُسے بصد اصرار بازار لے گیا ۔کپڑے کی بڑی بڑی دکانوں کا چکر لگاتا رہا ۔یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص کپڑے کا متلاشی ہو ۔کوئی خاص ڈیزائن اُس کے ذہن میں ہو ۔

''کیا بات ہے محسن، تم کیسا کپڑا چاہتے ہو؟ ساری دکانیں تم نے چھان ماری ہیں اور تمہیں کچھ پسند نہیں آ رہا ہے ۔'' وہ جزبز ہو رہی تھی ۔

''ارے گھبراؤ نہیں ۔بس یہ چند دکانیں اور دیکھ لوں ۔'' وہ اُسے گھسیٹ سا رہا تھا ۔

پھر وہ ایک دوکان میں گھسا۔اور جیسے اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔جیسے اُس نے گوہرنایاب دریافت کرلیا ہو۔سیلز مین ایک خوبصورت تھان کاونٹر پر کھولے کھڑا تھا۔

''میں یہی کپڑا چاہتا تھا۔''وہ خوشی سے چہکا۔

''بس یہی۔دوسوٹ پھاڑ دیں۔''

حیرت زدہ سی ثمینہ نے چندلمحوں کیلئے اس صورت حال کو دیکھا۔پھر جیسے گھپ اندھیرے میں ایکا ایکی بجلی چمک کر پل بھر میں اردگرد کی چیزوں کونمایاں کردے۔جیسے ذہن میں کہیں ایک جھماکا ہوااوراوپر تلے پڑی یادداشتوں کی پٹاری میں ہلچل مچ جائے اور کڑیاں مل جائیں۔

وہ آگے بڑھی۔دُکھی نظروں سے اُس نے شوہر کو دیکھا اور کاونٹر پر بکھرے کپڑے پر اپنا ہاتھ پھیلا کر متین سے لہجے میں سلیز مین سے جو کپڑے کواپنی گردن تک لگائے اسکی نمائش میں مصروف تھا کہا۔

''اسے پھاڑنا مت۔مجھے یہ پسند نہیں آیا۔'' یہ کہہ کر وہ محسن کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی تھی۔

چُپ چاپ چلتے ہوئے وہ گاڑی تک آئے اس میں بیٹھے۔محسن کے چہرے پر پھیلی خجالت اور شرمندگی کی پرچھائیں سی اُسے محسوس ہوئی تھیں۔پر وہ خودبھی اندر سے جیسے شکستہ سی ہورہی تھی۔گاڑی بھیڑ بھاڑ والے ماحول سے نکل کر جب کشادہ اور صاف ستھری سڑک پر آئی تو اُسے محسن کی مدھم سی آواز جیسے بے چارگی اور یاس میں لتھڑی ہوئی سنائی دی۔

''ثمینہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اُسے غصہ تو آیا پر ضبط کرتے ہوئے متانت سے بولی۔

''گھر گرہستی کی ذمہ داریوں میں کوڈے کوڈے دھنس کر میں اپنی انفرادیت،

اپنی پہچان اور اپنی ذات کو بھول گئی تھی۔ مرد اور اسکی جبلی فطرت کے رنگ ذہن سے یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔

پرانے مدرسہ فکر کے مطابق تمہارے دل تک پہنچنے کا راستہ تمہارا معدہ سمجھ بیٹھی تھی۔ تمہیں اچھے کھانے کھلاتے کھلاتے یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تم ایک مرد بھی ہو اور تمہاری نظر کی تسکین کیلئے مجھے جاذب نظر رہنا ہے۔ یہ تو اب جانی ہوں کہ دفتر میں جنکے ہمراہ دس گھنٹے گذارتے ہو اب انہیں گھر میں بھی دیکھنے کے آرزومند ہو۔"

دو اور دو چار

اب بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ مُشکی رنگ ناز وادا دکھائے تو محاوروں کی سان پر چڑھے اور دودھیا رنگت عشوہ طرازیاں دکھائے تو نزاکت کے زمرے میں آئے ۔ اُس کا حسن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نزاکت سے بھی چار ہاتھ اوپر کے خانے میں فٹ بیٹھنے والا ۔ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا ۔ ایک انتہا درجے کی خوبصورتی، اوپر سے غرور اور تکبر میں لتھڑی ہوئی ۔ برنارڈ شا کے کہنے کے برعکس ذہین بھی بہت تھی ۔ بہترین ادبی ذوق کی حامل ورڈزورتھ، شیلے اور کیٹس کی دیوانی، انگریزی ادب میں ایم ۔ اے کی سٹوڈنٹ اور لندن جانے کی شدید خواہش مند ۔

اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتی تھی ۔ چچیرے، ممیرے اور خلیرے بھائی تو بیچارے کسی گنتی میں شمار میں ہی نہیں تھے ۔ یُوں بھی ابھی کچھ تو پڑھ رہے تھے اور کچھ جو بے چارے نوکریوں پر لگے تھے بس یونہی سے تھے ۔ کبھی جو کوئی ازراہِ مذاق کسی کا نام لے دیتا تو کومل سے ناک کے نتھنے نخوت بھرے انداز میں سکیڑتے آنکھوں میں جہاں بھر کی حقارت سمیٹتے اور لہجے میں زہر گھولتے ہوئے کہتی ۔

”مذاق کا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے ۔ اب ایسے ایسے ٹٹ پونجیے تو راستوں میں

ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جو یقیناً جوتیاں مارنے کے قابل ہیں ۔کوئی بہت امیر بہت پڑھا لکھا بہت انٹلیکچوئل اور بہت ڈیشنگ قسم کا بندہ ہونا چاہیے ۔''

''یہ اتنے بہت سارے کہیں تیرا بیڑہ نہ کر دیں ۔کوئی منہ پھٹ سی سہیلی یہ کہنے سے باز بھی نہ رہتی ۔''

لندن جانے کی اس خواہش کی آتش کو تیز کرنے میں نعیمہ جان کا بہت ہاتھ تھا۔ نعیمہ جان جس نے تیرہ سال لندن میں گزارے تھے اور جس کی ہر بات کی تان لندن کے ذکر پر ٹوٹتی تھی ۔وہ انگلینڈ کی خوبصورتیوں اور رعنائیوں کے قصے سمیرا کو سناتی ۔جسے وہ دم سادھے سنا کرتی اور پھر تشنہ سی آرزوؤں میں لپٹا لمبا آزردہ سا سانس کہیں نیچے سے نکال کر خارج کرتے ہوئے کہتی ۔

''ممو جان تم کتنی خوش قسمت ہو ۔''

''وہ تو میں ہوں ۔نعیمہ جان آنکھیں نیم وا کرتی اور اپنی ممی کو دو دو سو صلواتیں سُناتی جو ان لوگوں کو پاکستان لے آئی تھیں ۔

میری جان زندگی کا ایک حصہ وہاں گزار کر آئے ہیں ۔یہاں کا ماحول نہ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے نہ دل کو چھتا ہے ۔''

اور سمیرا ایک زوردار دوہتڑ اُس کے شانے پر مارتے ہوئے کہتی ۔

''بند کر اپنی بکواس تو نے میرا دماغ خراب کر دینا ہے ۔''

اور نعیمہ جان آنکھیں مستی میں گھماتی اور کہتی ۔

''میں نے کیا کرنا ہے وہ تو پہلے ہی ہے ۔''

توقیر سمیرا کا فرسٹ کزن تھا ۔اس کے گھر کے قریب واقع بینک میں سیکنڈ آفیسر تھا ۔اچھی شکل وصورت کا لڑکا تھا ۔یوں بھی بہت محنتی اور ذمہ دار تھا ۔سمیرا کو بہت پسند کرتا

تھا۔اکثر بینک سے چھٹی ہونے پر ان کے گھر کا چکر ضرور لگاتا۔وہ کبھی برآمدے میں پام کے پودوں کے پاس کبھی باغیچے میں جوہی کی کلیوں کے پاس اُسے ملتی۔خوش دلی سے ہنستا اور کہتا۔

''ارے کامریڈ کیا شعر و شاعری کے چکر میں پڑی رہتی ہو۔زندگی دو اور دو چار کا نام ہے۔''

وہ اُس کے قریب آکر بیٹھ جاتا۔پام کے پتوں کو اپنی انگلیوں سے چیرتا اور اسے غور سے دیکھتا۔وہ اس کی اس حرکت پر تلملا کر رہ جاتی۔بس نہ چلتا وگرنہ بنخ کر اس کا سر زمین پر مار کر دو ٹوٹے کر دیتی۔غصیلی آواز میں چیخ کر کہنے پر ہی اکتفا کرتی۔

''گنوار کہیں کے۔بوٹوں کا ناس مت کرو۔''

''تمہیں بوٹوں کے ناس مارے جانے کا فکر ہے۔انسانوں کا بھی کبھی سوچ لیا کرو۔تمہاری بے رُخی سے ان کا ستیاناس نہ ہو جائے۔''

''مائی فٹ۔''

وہ پیر پٹختی اُٹھ جاتی۔اور توقیر مسکراتے ہوئے اُسے جاتے دیکھتا رہتا۔

وہ بہت اونچا اُڑنے کی متمنی تھی۔آسمانوں کی لامحدود وسعتیں اس کے سامنے تھیں۔نیچے دیکھنا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ایسے میں توقیر کے پسند آنے کے امکانات تو صفر تھے۔یہ اور بات ہے کہ وہ بے چارہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور سا تھا۔

جوئندہ یا پائندہ والی بات بالکل نہیں تھی۔وہ اور نعیمہ جان اس چلچلاتی سہ پہر میں فلم دیکھنے نکلی تھیں۔سٹیرنگ نعیمہ کے ہاتھوں میں تھا۔اُس نے موڑ تو مہارت سے کاٹا تھا مگر پھر بھی ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔سڑک پر ایک نوجوان گرا پڑا تھا۔جس کے ہاتھوں میں پکڑے

ہوئے لفافے دُور دُور تک بکھر گئے تھے۔

دونوں کے حلق سے خوفناک چیخیں نکلی تھیں۔دونوں کے رنگ اُڑ گئے تھے۔اور دونوں اپنے اپنے دروازے کھول کر تیر کی طرح باہر نکلی تھیں۔دونوں نے مضطرب ہو کر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی۔رش تو نہیں تھا۔سڑک بھی صاف ہی تھی پھر یہ سب کیسے ہوا؟ سامنے بہت خوبصورت۔نئے ماڈل کی بوتل گرین ٹیوٹا کھڑی تھی۔لباس،شکل وصورت، چہرے پر ٹپکتی وجاہت سبھی اس کے اعلیٰ جینٹری سے تعلق کا پتہ بتا رہے تھے۔وہ بے ہوش تھا۔ کہیں خون وون بھی نکلا نظر نہیں آیا تھا۔نعیمہ جان اضطراب اور پریشانی سے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ان چار پانچ راہگیروں کے چہرے دیکھ رہی تھی جو اُس پر جھکے اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ چوٹ کہاں لگی ہے؟ دوکانیں بھی یہاں نہیں تھیں تو پھر گاڑی روک اس نے کیا خریدا تھا؟سمیرا نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔لفافے سڑک پر بکھرے ہوئے تھے مگر ان میں جو کچھ بھی تھا وہ باہر نہیں نکلا تھا۔اس نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔کچھ ہی دور اسے وہ چھوٹا سا کھوکھا نظر آ گیا تھا جہاں عمدہ قلمی آم بڑے بڑے ٹوکروں میں سجا رکھا تھا۔

راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچانے کے لئے کہا۔دو تین تنومند قسم کے مردوں نے اُسے اُٹھایا اور کار کی بیک پر آڑھا ترچھا لٹا سا دیا۔دو مردوں کو انہوں نے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔نعیمہ جان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگی تو سمیرا نے سرگوشیانہ انداز میں ڈانٹ پلائی۔

''کمبخت پیچھے ہٹو۔یہ لندن ہے جو بگٹٹ گاڑی بھگائے جاتی ہو؟''

''میں نے تو ایسی ذلیل سڑکیں کہیں نہیں دیکھیں۔''

''یہاں تو دیکھ رہی ہونا۔''سمیرا نے کار سٹارٹ کر دی۔

ایمرجنسی میں داخلہ ہو گیا۔ڈاکٹر معائنہ کرنے لگا۔جب اسے یہ خیال آیا۔

اللہ! پتہ نہیں کس کا بیٹا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کہاں جا رہا تھا؟ جیبیں دیکھنی

چاہئیں شاید کوئی اتہ پتہ مل جائے۔

''سنو نعیمہ'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اس کی جیبیں دیکھیں شاید اس کا کارڈ وا ڈ ہو۔ گھر کا پتہ چلے تو اطلاع کریں۔''

اور نعیمہ نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

''کروک۔ انہوں نے اُٹھا کر پولیس میں رپٹ لکھوادی تو بتاؤ پولیس اسٹیشن کے دھکے کھاتی پھرو گی۔ شکر کرو راہگیر سیدھے سادھے سے تھے وگر نہ کوئی تیز طرار ہوتا تو آج پھنس گئے تھے۔''

''تو اب کیا ہونا چاہیے؟''

''ذرا صورت حال واضح ہو جائے تو بھاگ چلتے ہیں۔''

''یہ غلط بات ہوگی۔ اس کی نئی نویلی گاڑی وہاں کھڑی ہے۔ چوری ہو سکتی ہے۔ اس کی حالت بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ایسے میں بھاگ جانا انسانیت کے خلاف ہے۔ ہمت سے صورت حال کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بہتر ہی ہوگا۔''

ڈاکٹر نے سوالات کی بھر مار کردی تھی۔ سمیرا بہت ذہین تھی۔ بات کو خوبی سے نبھا گئی اس کے اس سوال پر کہ معاملہ کچھ خطرناک تو نہیں۔ اس نے کہا۔

''دیکھئے۔ آپ ذرا یہ دوائیں لے آئیں۔''

اس نے نعیمہ کو دوائیں لانے کے لئے دوڑایا۔ اور خود اس کی جیبوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پینٹ کی جیب سے چابی نکل آئی تھی۔ والٹ بھی مل گیا جس میں اس کا کارڈ تھا۔

''اللہ کرے اب یہ کارڈ اس کا ہی ہو۔''

چابی اور والٹ دونوں اُس نے اپنے بیگ میں ڈال لئے۔

نعیمہ دوائیں لے آئی تو اس نے دونوں چیزوں کے بارے میں اُسے بتایا۔ فیصلہ

ہوا کہ وہ اس کے ورثاء کو اطلاع دے اور نعیمہ اس کے پاس ہی رہے۔

نعیمہ نے منہ بسورا۔

''دیکھو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔کسی مصیبت میں نہ گھر جائیں۔پلیز سمی ایسی ہمدردی کا کوئی فائدہ نہیں جس میں انسان کسی آفت میں مبتلا ہو جائے۔''

مگر سمیرا نے پھر ڈپٹا۔

''تمہیں یہاں چھوڑنے کا مقصد ہے کہ کسی دوائی کی فوری ضرورت پڑ سکتی ہے۔مریض کو ہوش آ سکتا ہے۔''

یہ کہانی موبائلوں کے دور سے قبل کی ہے۔اسپتال سے باہر نکل کر اُس کا پہلا کام قریبی میڈیکل سٹور سے کارڈ پر لکھے گئے نمبر پر رابطے کی کوشش تھی۔ایک لمبی سی ٹون سُننے کو ملی۔پندرہ بیس منٹ تک اس سعی لا حاصل نے اُسے زچ کر دیا۔وہ باہر آ گئی۔سڑک پر رواں دواں انسانوں اور گاڑیوں کے پُرشور ہجوم کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔اب کیا ِکیا جائے؟

گھر پر پاپا ضرور تھے پر دل کے مریض جنہیں وہ کوئی ایسی خبر سنانے کی روادار نہ تھی۔مما مسز زبیری گرلز کالج میں تاریخ کی پروفیسر خاصی جی دار اور تیز طرار خاتون پر وہ اس وقت کالج میں تھیں۔تھوڑی دیر قبل سمیرا نے ہی انہیں کالج کے کسی فنکشن کے سلسلے میں ڈراپ کیا تھا۔نوید اُس کا بھائی ابھی ایف ایس سی کا سٹوڈنٹ اور نوریا نوید سے بھی چھوٹی۔

سمیرا جب گھر سے نکلی نوید ٹیوشن کے لئے چلا گیا تھا۔پل بھر کے لئے اُسے نعیمہ کا بھاگ جانے کا مشورہ معقول لگا۔

''غلطی کی۔کس جھنجھٹ میں پھنس گئے ہیں۔''

پر اگلے لمحے ایک بے حد وجیہہ اور دلکش چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔کسی ماں کا بیٹا

جو خالصتاً نعیمہ کی لاپرواہی کا شکار ہوا تھا۔ وقت کو تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کر اُس نے فی الفور سر جھٹکا۔ برق انداز میں کچھ سوچا۔ اپنی گاڑی میں سوار ہونے کی بجائے رکشے میں بیٹھنے کو بہتر جانا۔ راستے میں اُس نے کارڈ کو پرس سے نکال کر ذرا تفصیل اور سکون سے دیکھا۔

''مجید اشرف۔''

''ارے کیسا پینڈو یا نہ سا نام ہے؟ ذرا لگا نہیں کھاتا شخصیت سے۔''

حادثے والی جگہ پر گاڑی کھڑی تھی۔ اُس نے چابی لگائی۔ دروازہ کھولا اس میں بیٹھی۔ ایسی شاندار گاڑی دل یوں دھڑکا جیسے ابھی گوشت پوست کو چیرتا ہوا باہر آجائے گا۔ پیشانی پسینے میں تر بتر ہوئی۔ سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ چند لمحے وہ ساکت بیٹھی رہی۔ خود کو نارمل کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔

نچلے متوسط گھرانے کی پروردہ پڑھے لکھے ملازم پیشہ والدین کی بیٹی جن کے پاس گاڑی تو ضرور تھی۔ پر چھوٹی سی اکلوتی بیچاری اُس محنت کش انسان جیسی جو اپنے پریوار میں دو تین کو اگر جوتے لے کر دیتا تو دو تین کپڑوں سے رہ جاتے ہیں۔ گوشت خریدتا ہے تو پھل پر ڈنڈی بج جاتی ہے۔

خود پر قابو پانے کے بعد اُس نے سارے سسٹم کا جائزہ لیا۔ اور پھر اللہ کا نام لے کر سٹارٹ کردی تھوڑی دیر تک آہستہ آہستہ چلی پھر اعتماد سے فراٹے بھرنے لگی۔

گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ یہ پوش ایریا تھا۔ یہیں سمیرا کی ایک دوست بھی رہتی تھی۔ کارڈ پر درج نمبر کے عین مطابق جب اُس نے سی تھرو گیٹ سے اندر کا منظر دیکھا تو اُسے ایک بھرپور جھٹکا سا لگا۔ وسیع و عریض لان اور محل نما گھر اُس کے سامنے تھا۔ باوردی گارڈ سے سوال جواب ہوئے اور اُس نے جانا کہ مجید اشرف کے والدین لندن

میں، بڑے دونوں بھائی امریکہ اور جاپان میں۔ان کالمبا چوڑا بزنس جس کے لئے سبھی باری باری یہاں آتے رہتے ہیں۔خود مجید اشرف ابھی چار دن پہلے بنکاک سے آیا تھا۔

اُس کے بارے میں ضروری معلومات کے ساتھ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے نوکر اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔وہ اس کے تفتیشی انداز پر پریشان اور اپنے مالک کے بارے میں فکرمند تھے۔اور جب اُس نے یہ کہا کہ اُن کی مسز تو یہاں ہوں گی اُن سے میری بات کروا دیں۔اُن میں سے جو نسبتاً زیادہ سمجھدار تھا اُس کی طرف یوں دیکھتے ہوئے جیسے اُس نے کوئی بہت ہی احمقانہ بات کر دی ہو کہا۔

''لو بیٹا اُس کی بیوی کہاں سے؟ وہ تو ابھی کنوارہ ہے۔''

اُس لمحے بس اُسے یوں لگا جیسے موسم اور اس حادثے کی تلخی سبھی انجانی سی راحت میں بدل گئی ہیں اور سینے میں ٹھنڈک سی اُتر گئی ہے۔

چلو مجھے فون کرواؤ اور ہاں ڈرائیور بھی اگر ہے تو بُلوا لیں۔

ایک سمجھدار سا ادھیڑ عمر کا مرد اُسے لان میں چھوٹی سی جھیل نما تالاب پر بنے چوبی پُل سے گزارتا ہوا اندر لے کر داخل ہوا۔راہداری میں سے گزرتے ہوئے اُس نے چند مزید جھٹکے کھائے۔فون اُس نے گھر کیا۔اپنی ماں کو انگریزی میں مختصراً بتایا کہ وہ تیار رہوں۔تھوڑی دیر میں وہ انہیں لینے آتی ہے۔

جب وہ ریسیور کانوں سے لگائے ماؤتھ پیس پر باتیں کرتی تھی۔اُس کی نظریں سامنے والے کمروں کی طرف اُٹھی تھیں جن کے دروازے کُھلے تھے اور اندر جس طرح کا ماحول نظر آتا تھا وہ اُس نے ہالی وڈ کی فلموں میں ہی کہیں دیکھا تھا۔سحر زدہ اور مبہوت کرنے والا۔ملازموں کو اس نے ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتایا ضرور پر پریشان کرنے والے انداز میں نہیں، یہ بھی کہا کہ وہ تو بس راہگیر تھیں انسانی ہمدردی کے ناطے یہ سب کر رہی

ہیں۔اور یہ تاکید کرنا بھی نہیں بھولی کہ کسی بھی صورت والدین یا بھائیوں کو اطلاع نہیں دینی۔بلاوجہ پریشان کرنے سے فائدہ۔

عجیب سی بات تھی۔اُس کا ذہن برق رفتاری سے کام کرنے لگا تھا۔معاملات کو اُس نے جیسے خود ہینڈل کرنے کا منصوبہ ذہن میں مرتب کرلیا تھا۔ڈرائیور اُس کی رہنمائی میں پہلے اس کے گھر گیا۔مسز زبیری تیار تھیں۔انہیں لیا۔راستے میں اُس نے اپنی ماں کو جس انداز میں اُس کے امارت کی تفصیل اور اُس کے غیر شادی شدہ ہونے کا بتایا وہ اُس کی حسرتوں کا غماز ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ اس احساس کی بھی چغلی کھاتا تھا کہ انہیں قدرت نے یہ موقع فراہم کیا ہے اور انہیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔اُسے یہ بھی خدشہ تھا کہ ایسا نہ ہو چوٹ زیادہ گہری ہو۔خدانخواستہ کوئی سیریس معاملہ نہ ہو جائے اور وہ دھرلی جائیں۔

مسز زبیری بھی کچھ متفکر ہوئیں۔پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''گھبراؤ نہیں بہتر ہی ہوگا۔''

مسز زبیری کی دوست کا بیٹا اسی اسپتال میں سرجن تھا۔وہ اس کا معلوم کرنے کے لئے ریسپشن پر رُک گئیں سمیرا سے یہ کہتے ہوئے تم چلو میں تو صیف کا معلوم کر کے آتی ہوں۔

نعیمہ سٹول پر بیٹھی تھی اور چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔وہ ابھی تک بے ہوش ہی تھا۔اُسے تنہا اور پریشان آتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس لپکی۔

''کچھ بنا؟''

وہ بڑی مایوسی سے ہنس پڑی۔میں تو گئی تھی نماز بخشوانے اور یہاں روزے بھی گلے پڑ گئے۔معاملہ بڑا ٹیڑھا ہو گیا ہے۔اس نے سٹول پر بیٹھ کر ساری بات اس کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

''ممی میرے ساتھ ہی آئی ہیں۔چلو اب فکر کی کوئی بات نہیں۔''
''اُف تم کس پراگے میں پڑ رہی ہو۔لعنت بھیجو سب پر چلو چلیں۔''
''نعیمہ تمہاری عقل گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی۔کیسے چھوڑ جائیں اُسے؟''
''سمیرا چلو پھر مجھے جانے دو میں دوپہر کی گھر سے نکلی ہوئی ہوں۔ممی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

نعیمہ چلی گئی۔اور اب وہ اس کے پاس بیڈ کے قریب رکھے سٹول پر بیٹھ گئی۔

کسی پرائیوٹ ہسپتال میں لے جانا چاہیے۔خدا معلوم کتنی گہری چوٹ ہے جو اب تک ہوش نہیں آیا۔

''میرے اللہ رحم کر۔''اور رحم ہو گیا تھا کیونکہ اس نے آنکھیں کھولیں اور بے حد حیرت سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔سمیرا لپک کر اس کے قریب ہوئی۔اس لمحے اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ ایک اجنبی ہے۔شاید جو حادثہ پیش آیا تھا اور اس کی جو حیثیت سامنے آئی تھی اس نے اجنبیت کی ساری دیواروں کو جیسے گرا دیا تھا۔وہ جیسے سمیرا کی ذمہ داری تھی۔

''آپ کون ہیں۔اور میں کہاں ہوں؟''

''میں جو بھی کوئی ہوں یہ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔یہ بتایئے کہ کہیں درد تو نہیں محسوس ہو رہا؟''

''درد!''اس نے زیرِ لب دہرایا۔

''ہاں ہاں!ذرا بازوؤں کو ہلائیں۔ٹانگوں کو دیکھیے۔کہیں تکلیف محسوس ہوتی ہو؟''

اس کے کہنے پر چند لمحے جیسے وہ اپنے سارے وجود کا جائزہ لیتا رہا اور پھر بولا۔
''سر کے دائیں حصے میں یہاں۔''اس نے کنپٹی کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں تھیں ۔سمیرا کو یوں لگا جیسے دو جلتے چراغ بجھ گئے ہوں ۔

''اللہ میرے! کس قدر دلآویز شخصیت ہے ۔''

عین اسی وقت ممی بھی آ گئیں ۔سمیرا نے ہوش میں آنے کی ساری تفصیل ماں کو بتائی ۔مسز زبیدی نے پرائیوٹ ہسپتال لے چلنے کا کہا۔

کوئی گھنٹہ بھر میں ساری شفٹنگ ہوگئی ۔ڈاکٹروں نے فوری معائنہ کیا پر وہ لوگ ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے ۔

کوئی بارہ بجے تک وہ اس کے پاس ٹھہرے پھر نوید وہاں رہا۔ممی اور وہ دونوں گھر چلی آئیں۔

صبح سویرے بغیر ناشتہ کئے وہ پھر کلینک بھاگی ۔وہ جاگ رہا تھا اور نوید سو رہا تھا ۔

''ہیلو۔صبح بخیر۔کیسی طبیعت ہے؟'' وہ اُس کے بیڈ کے قریب آ کر اس پر جھکتے ہوئے بولی ۔

سنجیدہ سے چہرے پر کچھ سوال تھے جنہیں اُس نے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ کھائیں گے؟''

جواب میں خاموشی تھی۔

اُس نے چائے کپ میں انڈیلی اور آہستگی سے اُس کے سر کو سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے کپ کو اُس کے ہونٹوں سے لگایا ۔چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اُس نے کپ خالی کر دیا ۔

اس کی سنجیدگی اور متانت سمیرا کو کھلی تھی ۔اس کی بہت سی باتوں کے جواب میں

اُس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھرتی یا پھر مختصر سا جواب۔ سمیرا جیسی ذہین لڑکی کے لئے یہ کچھ ایسی حوصلہ افزا صورت نہ تھی۔ پر یہ اجنبی اُس کے دل کو بے طرح بھایا تھا۔ سنجیدہ سا۔ اتنی سی عمر میں میں آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکا تھا۔ کہیں بھی کوئی پہلو کمزور نہیں تھا۔ اُس دن جب وہ اُس کے لئے گھر سے سوپ بنا کر لائی۔ کمرے میں موجود چند غیر ملکی جن کے ساتھ وہ گفتگو میں مصروف تھا۔ کاروباری بات چیت میں اُس نے کوئی دس ملکوں کے حوالے دے ڈالے تھے۔ اُس کی پسندیدگی کے جذبات اس واقعے سے کچھ اور سوا ہوئے۔ اُسے سوپ کا پیالہ دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آپ کو اتنا بولنا نہیں چاہیے تھا۔''

''مجبوری تھی۔'' بس اس سے زیادہ اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

اُس رات اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے وہ بڑی بد دل سی تھی۔ دھیرے سے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے جیسے میں خواب بننے لگی ہوں۔''

پر کہیں ایک چھوٹی سی امید کی کرن بھی تھی۔

اتنے ڈھیروں نوکروں کے باوجود اُس کے کھانے پینے کی سب چیزیں سمیرا کے گھر سے تیار ہو کر آتی تھیں۔ ایک اجنبی نوجوان کی اس درجہ دیکھ بھال پر سمیرا نے پہلے ہی دن اس کے ہوش میں آنے پر اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی ذمہ دار ہے۔ اسپتال کا بل دینے کی تو اُن میں استطاعت نہیں پر اُس کی خدمت سے وہ اپنی لاپروائی اور غلطی کا کفارہ ادا کرنے کی خواہش مند ہے۔

اُس کی اس وضاحت کے جواب میں اُس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری تھی اور جواباً اُس نے صرف اتنا کہا تھا۔

''شاید میری بھی غلطی ہو۔''

دوبار زبیری صاحب آئے۔ زبیری صاحب کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر اُس کی خوب باتیں ہوئیں۔ مسز زبیری بھی خدمت میں پیش پیش تھیں۔

بس اگر شاکی تھی تو صرف سمیرا۔ جو کسی اشارے، کسی بول، کسی امید بھرے الفاظ کی منتظر تھی۔ پر وہاں خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ اور کسی آس میں رہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

یہ غالباً ساتواں روز تھا جب وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہو۔ وہ ہونقوں کی طرح دیکھتی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ ڈسچارج ہونے کے لئے تو گزشتہ دنوں سے بضد تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور یہ پرائیوٹ اسپتال والے بلاوجہ ہی اپنے پیسے بٹورنے کے لئے فضول کے اُلجھاؤ میں اُسے ڈالے ہوئے ہیں۔

سمیرا نے جواب میں نیورو سرجن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بہتر ہے اس کے مشورے کے مطابق چلا جائے۔

اور اس کا لہجہ سمیرا کو حیران کر گیا تھا جب اس نے کہا۔

''سب ڈھکوسلے اور بکواس ہیں۔ مجھے تو آج تک کبھی ہلکا سا ٹمپریچر تک نہیں ہوا۔ یہ چوٹ جانے کیسے لگ گئی؟ ہمارے پیچھے دعاؤں کے لئے بے شمار ہاتھ ہیں۔''

تو وہ پھر چلا گیا اُسے کوئی اطلاع دیئے بغیر۔ کس قدر کم ظرفی کی بات تھی۔ وہ اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر ہمیشہ بیٹھتی تھی۔

حیرت تھی اُسے خود پر۔ اس کا وہ طنطنہ، اس کی پھنکاریں، سب جیسے صابن کے جھاگ کی طرح تھیں، جنہیں امارت اور وجاہت کے پانیوں نے گھول کر رکھ دیا تھا۔ کیسا کٹھور انسان تھا؟ اتنے دن خدمت کی کیا اس قابل بھی نہیں سمجھا گیا کہ جانے کا ہی بتا دیتا۔

اندر جیسے زخمی تھا سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے ان پر پھاہے رکھے؟

کتنی احمق ہوں میں؟ سب کچھ تو نظر آ تا تھا۔ پاؤں تلے تو ریت ہی ریت تھی۔ میں کیوں نہ سمجھی؟ اسی ریت پر گھروندے بنانے لگ گئی۔ اب ٹوٹنے تو تھے ہی۔ پتہ نہیں کہاں سے جیسے آنسوؤں کا ایک ریلا سا آ گیا۔ ہر چیز دُھندلی سی ہوتی گئی۔ اُس نے سر کرسی کی پشت پر پھینک دیا اور ریلے کے اس تیز بہاؤ کے سامنے کوئی بند لگانے کی کوشش نہ کی۔ دیر بعد جب ہلکی ہوئی تو باتھ روم میں جا کر منہ دھویا۔ باہر نکلی۔ ریسپشن سے پتہ چلا کہ ابھی کوئی گھنٹہ بھر پہلے ڈسچارج ہوئے ہیں۔

کیا تھا تھوڑا سا انتظار کر لیا جاتا۔ فون کر کے اطلاع دے دی جاتی۔ اُسے معلوم بھی تھا کہ میں کم و بیش اسی وقت آتی ہوں۔ یہ سب قصداً کیا گیا کہ میری دل آزاری مطلوب تھی۔ اپنا آپ اسے اس سمے ہواؤں میں اُڑتے کاغذوں جیسا ہلکا محسوس ہوا، بے وقعت، بے وزن اور بے آبرو جیسا۔ محسوسات کی شدت نے اُس کی آنکھوں میں پھر نمی اُتار دی تھی۔ چلتے چلتے اُس نے کئی بار خود کو لعن طعن کی۔

گھر آئی تو مسز زبیری کہیں گئی ہوئی تھیں، پر باپ موجود تھے۔ جنہوں نے اُسے بتایا کہ مجید اشرف کا فون آیا تھا۔ وہ شکر گزار تھا ہم سب لوگوں کے خلوص اور محبت کا۔ میں نے اُسے کسی دن اپنے گھر آنے کے لئے بھی کہا۔ اُس سے بات چیت کر کے مزہ آتا ہے۔

سمیرا کے چہرے پر عجیب سے یاس بھرے رنگ بکھر گئے۔ تاسف بھرے لہجے میں اُس نے کہا۔

''ارے پاپا آپ نے کیوں اُسے گھر آنے کی دعوت دی؟ یہ امیر لوگ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ ہم جیسے لوگ تو شاید انہیں انسان ہی نہیں لگتے۔''

اور جب وہ روکھی سی آواز میں اپنے باپ سے یہ کہتی تھی اُسے قطعی یاد نہیں تھا کہ

وہ کب ماڑے سوٹے انسانوں کو خاطر میں لاتی تھی؟ اُن کا مذاق اُڑانا اور انہیں حقیر جاننا اس کی سرشت میں داخل تھا۔

ارے نہیں بیٹے وہ تو بڑا منسکر المزاج لگتا ہے۔ دو بار کی ملاقات نے مجھ پر تو اس کا بہت اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ فون پر بھی اُس کا لہجہ ملتجی اور متانت میں گھلا ہوا تھا۔

اُس نے بحث نہیں کی۔ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ میں اُسے پسند کرنے لگی ہوں۔ اور یقیناً میں اس کی پسند نہیں تھی۔ سو اُس نے اپنا ردِعمل واضح کرتے ہوئے سب کچھ مجھے سمجھا دیا تھا۔ اب میں ہی پاگل بنی رہی۔

مسز زبیری گھر آئیں۔ چائے کی طلب نے گھر میں گھستے ہی انہیں چھوٹی بیٹی نویرا کو پکارنے پر مجبور کر دیا۔ دو تین آوازوں پر بھی کوئی جواب نہ پا کر اُس کے کمرے میں آئیں وہ ٹھٹھک سی گئیں۔ سامنے صوفے پر سمیرا گم سی بیٹھی تھی۔ پژمردہ سی، افسردگی کی چادر میں جیسے لپٹی ہوئی۔

''کیا بات ہے بیٹے تم اس وقت یہاں کیسے؟ اسپتال سے کب آئیں؟''

ماں کے اتنے میٹھے محبت بھرے لہجے میں استفسار پر آنسو ایک قطار کی صورت میں اس کے گالوں پر آ گئے۔ وہ بھی گھبرائیں۔

''کیا ہوا؟''

مضطرب بھرے لہجے میں پوچھتی پاس ہی بیٹھ گئیں۔

بھرائے ہوئے لب و لہجے میں اُس نے دل میں حشر برپا کرتے طوفان کے بارے میں مختصراً ماں کو بتایا۔ لڑکا انہیں بھی پسند آیا تھا۔ دل و جان سے چاہتی تھیں کہ ان کی خوبصورت پڑھی لکھی، شائستہ رکھ رکھاؤ والی بیٹی اس لڑکے کے دل میں گھر کر لے۔

اب اپنی طرف سے تو بہتیری کوشش کی ۔رات دن کی مسلسل مشقت اور روپے پیسے کا فراوانی سے خرچ اب اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتی تھیں؟ نچلا متوسط گھرانہ جہاں ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا جیسی صورت ہمہ وقت ہی درپیش رہتی تھی ۔

''چلو چھوڑو بیٹے جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے ۔''

انہوں نے بیٹی کی آزردگی کو کم کرنے کی کوشش کی ۔

''اُف ممی اتنا ہینڈسم، اتنا ڈیشنگ ،ایسا انٹلیکچوئل ، اتنا امیر، کہیں آپ اُس کا گھر دیکھتیں تو دنگ رہ جاتیں ۔مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی پھولوں پھلوں سے لدا پھندا نخلستان میرا مقدر بننے والا تھا پر کسی نے یکلخت مجھے تپتے ریتلے صحرا میں پھینک دیا ہو ۔جیسے میں حیات بخش شربت کا گلاس منہ کو لگانے والی تھی کہ اُسے مجھ سے چھین لیا گیا ۔''

بیٹی کی اس حد تک دل گرفتگی پر مسز زبیری کا دل کٹ کٹ جا رہا تھا ۔چند لمحوں بعد انہوں نے کہا ۔

''میرا خیال ہے میں فون کروں ۔'' انہوں نے اپنی خواہش کیلئے بیٹی کی تائید چاہی ۔

پر سمیرا نے نفی میں سر ہلایا ۔

''چھوڑیئے کوئی فائدہ نہیں ۔اُس نے پاپا کو فون پر شکریے کے چند لفظوں سے اپنے حسابوں ہمارے احسان کا بدلہ اُتار دیا ہے ۔''

بایں ہمہ مسز زبیری نے اپنے طور پر فون کیا ۔نوکر نے سُنا اور بتایا کہ صاحب اس وقت چند غیر ملکی لوگوں کے ساتھ مصروف ہیں ۔میں آپ کا پیغام دے دوں گا ۔

ایک آدھ دن مسز زبیری کو بھی انتظار رہا ۔پھر اُنہیں بھی سمجھ آ گئی کہ وہ ہی لوگ بیوقوف تھے جنہوں نے صرف شکل اور تعلیم کے بل پر اتنا بڑا خواب دیکھ لیا تھا ۔مخمل میں ٹاٹ

کے پیوند کون لگاتا ہے؟

جلد ہی فائنل امتحان شروع ہو گئے۔ بے دلی سے وہ اس کی تیاری میں اُلجھ گئی۔ پر نہ تو اس اُلجھاؤ نے اور نہ گزرتے دنوں نے اس کی بے کلی کو گھٹایا البتہ بڑھانے کا کام ضرور کیا۔ اُس کے دل سے ایک لمبی سی ہوک اُٹھتی۔ جو آنکھوں کو گیلا کر جاتی۔

پھر ایک دن عجیب سا واقعہ ہوا۔ شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ سمیرا پیپر دے کر گھر آئی۔ گیٹ کے سامنے سیاہ چمچاتی نئی نویلی گاڑی کھڑی تھی۔ اُس کا دل جس انداز میں دھڑکا اُسے محسوس ہوا جیسے گوشت کی تہیں ہٹاتا ابھی پھدک کر باہر آ گرے گا۔

کون آیا ہے؟ مجید اشرف۔ اس کا سوال خود سے تھا۔ اور جواب بھی اُس نے خود ہی اپنے آپ کو دیا تھا۔

بھلا اُس نے یہاں کیا لینے آنا ہے؟

تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ شاید کریم صاحب کا کوئی عزیز ہو۔

بائیں طرف کے ہمسائے کریم صاحب کے کینیڈا میں بسنے والے رشتہ داروں کی کبھی کبھار ایسی ہی لمبی گاڑیاں ان کے گھروں کے سامنے کھڑی دیکھنے کو ملتی تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ ڈرائینگ روم سے پاپا کے اُونچے اُونچے باتیں کرنے کی آوازوں نے اُسے بتا دیا تھا کہ مہمان کون ہے؟

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ متضاد کیفیات کا شکار تھی۔ جس کی چاہت میں ہلکان ہو رہی تھی اُس کی آمد کا مفہوم آئندہ کسی نوید کا باعث بھی ہو سکتی تھی۔ اس آمد کا کرٹسی کے طور پر بھی امکان تھا۔ اُس نے بیگ تپائی پر رکھا اور لیٹ گئی۔ وہ کمرے کے اندر ضرور تھی پر اُس کے ساری حسیات اور سماعتیں کمرے سے باہر تھیں۔ پھر جیسے اُسے گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اور اس آواز کے ساتھ ہی جیسے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

''تو کیا وہ چلا گیا مجھ سے ملے بغیر۔''

پر اس تلخ سوچ کے منفی اثرات اُس کے اندر رہا ہر پھیلنے سے پہلے ہی اُس کی ماں، بہن اور بھائی کے جگمگاتے گُل رنگ چہروں اور کلکاریاں مارتے قہقہوں نے ختم کر دیئے تھے۔ ابھی مسز زبیری اور نویرا میں سے کسی نے بھی اپنے چہروں پر رقصاں بے پایاں خوشی کی توجیہہ کے بارے میں کچھ بتانے کے لئے لب کھولے نہیں تھے کہ زبیری صاحب ایک بڑا اٹیچی کیس دھکیلتے ہوئے اور چہکتی ہوئی آواز میں یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

''ارے بھئی ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہماری سمیرا اتنی بخت ور ہوگی۔''

''اس کا نصیب تو کسی مہارانی جیسا دکھتا ہے۔''

مسز زبیری بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''دراصل وہ تو اگلے دن لندن اپنے والدین کے پاس چلا گیا تھا۔ اُس نے تو کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ سمیرا اور اس کے گھر والے اُسے بہت پسند آئے تھے پر اپنے ماں باپ کی رائے کے بغیر وہ کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی پسند پر اطمینان بھری رائے لے کر وہ ہمارے ہاں آیا ہے۔''

اسی دوران نویرا نے اٹیچی کیس کھول لیا تھا۔ اور پورا خاندان اس میں رکھے گئے ہیروں کے چھوٹے بڑے سیٹ اور انتہائی قیمتی کپڑوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

سمیرا کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ نکاح اور شادی کی تاریخوں کا تعین بھی خود ہی کر گیا تھا۔ درمیان میں صرف دس گیارہ دن تھے جس میں فوری طور پر اُس کا پاسپورٹ اور ویزا بننا تھا۔ ایک ہفتہ اپنے والدین کے پاس لندن میں قیام کے بعد انہیں پیرس جانا تھا جہاں اس کے بڑے بھائی کی ڈریس ایگزیبیشن ہو رہی تھی۔

وہ ایک پھر گم سی بیٹھی تھی۔ قدرت کے اس معجزے پر حیرت زدہ۔ مقدر اس قدر

تابناک ہوسکتا ہے؟ یہ حقیقت ہے یا خواب ۔اُس نے خود سے سوال کیے تھے ۔

اور آنے والے چند دن ایسے ہی تھے کہ جن کے ہر ہر دن پر اُسے خواب کا سا گمان گزرتا ۔وہ ہر ہر مرحلے پر اپنے آپ سے یہی سوال دہراتی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بیٹی کے والدین کی حیثیت سے اُس کا خاندان کسی بھی مرحلے پر نہ تو مالی لحاظ سے اور نہ ہی جسمانی لحاظ سے زیر بار ہوا۔انتظامات انتہائی اعلیٰ پیمانے کے تھے جن میں اُن کی شمولیت ہر فکر اور پریشانی سے مبرا تھی ۔اُس کے رشتہ دار خصوصاً اس کا پھوپھی زاد بھی دنگ تھا۔

اور وہ شادی کے تیسرے دن جہاز میں بیٹھی لندن کی طرف رواں دواں تھی ۔ دفعتاً عقبی نشست سے کسی نے غالباً اپنے ساتھی سے کہا تھا۔

''دیکھو ذرا نیچے ہم شاید لبنان کے اوپر سے گزر رہے ہیں ۔''

اُسے جیسے بجلی کا کرنٹ لگا ۔وہ سیدھی ہوئی اور کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگی ۔اُسے تو کچھ بھی نظر نہ آیا ۔اُس نے مجید اشرف کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مجی واپسی پر اگر ہم جبران کے لبنان میں چند دن رُکیں ۔مجھے اس کا دیس دیکھنے کی کتنی حسرت ہے شاید تم اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔''

''بھئی کون جبران؟''اُس کی خوبصورت آنکھوں سے چھلکتی حیرت سمیرا کے لئے حد درجہ استعجاب کا باعث تھی ۔اُس نے ذرا سے تنک چڑھے انداز میں کہا۔

''تم نے جبران کو نہیں پڑھا؟''

''نہیں''۔

نارمل سے لہجے میں یہ لفظ کہہ کر اُس نے چند لمحے توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھایا تو اُس کے لہجے میں بھرپور اعتماد کی جھلک بھی نمایاں تھی اور طمانیت بھی ۔

''میں نے صرف ساتویں جماعت تک پڑھا ہے۔ہم لوگ سُنار ہیں۔اندرون مغلپورہ میں ہمارا پانچ مرلے کا چھوٹا سا گھر تھا۔بازار میں چھوٹی سی دوکان تھی۔پھر میرا بڑا بھائی باہر چلا گیا۔اُس نے سمگلنگ شروع کر دی۔''

مجید اشرف نے قصداً رُک کر اُسے دیکھا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''ارے بھئی ہیروئن کی نہیں۔سونے اور ہیروں کی۔''

آسمان کی چھت پھٹ گئی تھی اور اس میں سے حُسن برسنا شروع ہو گیا تھا۔

''پڑھائیاں تو اُڑنچھو ہوئیں اور ہم سب اس میں مصروف ہوئے۔دھیرے دھیرے ہم نے سب غیر قانونی دھندے ختم کئے۔کاروبار کو قانونی صورت دی۔الحمدللہ آج ہمارا ایک پاؤں امریکہ ہے تو دوسرا جاپان۔تیسرا آسٹریلیا اور چوتھا فن لینڈ''۔

سمیرا کے سر پر جیسے بم پھٹا۔ہکلاتے ہوئے وہ بولی۔

''تو تم پڑھے لکھے نہیں ہو۔تم نے شیلے،کیٹس اور ورڈز ورتھ کو نہیں پڑھا۔''

''ہرگز نہیں۔''

اُس کے چہرے پر شوخی سے لبریز مسکراہٹ تھی جیسے وہ محظوظ ہو رہا ہو۔

''نہیں مجی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟مذاق مت کرو۔دیکھو میرا سانس سینے میں اٹک رہا ہے۔مجھے اختلاج سا ہو رہا ہے۔تم تو آکسفورڈ کے پوسٹ گریجوایٹ ہو۔''

بڑی جارحانہ مسکراہٹ تھی۔جس سے اُس نے سمیرا کو دیکھا تھا۔بڑا جارحانہ سا انداز تھا جب اُس نے کہا۔

''حقیقت یہی ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔''

اور وہ جیسے پھٹ پڑی۔

''یہ کتنا بڑا افراڈ ہے؟ کتنا بڑا دھوکہ ہے؟''

مجید اشرف کا چہرہ پل جھپکتے میں تانبے جیسا سرخ ہوا۔اُس کی آنکھوں میں جیسے قہر ٹوٹ پڑا۔وہ انگریزی میں دھاڑا۔

''How dare you to say?''

'' تم اپنے حواسوں میں تو ہو۔میرے تینوں بھائی انڈر میٹرک اور میری تینوں بھابھیاں دو ڈاکٹر اور ایک سی۔اے اور وہ بھی لندن کے امیر کبیر پاکستانی خاندانوں کی۔تم ادھورے ایم۔اے کے ساتھ بھوکے ننگوں کی بیٹی۔آئندہ اگر ایسی بکواس کی تو گردن مروڑ دوں گا۔زندگی شیلے اور کیٹس کو پڑھنے کا نام ہے۔زندگی دو اور دو چار کا نام ہے۔سمجھیں۔''

وہ پھر دھاڑا۔

''تمہیں سمجھ آگئی ہے۔جواب دو۔''

''سمجھ گئی ہوں۔''

پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے سمیرا کی آواز ایسی ہی تھی جیسے کسی گہرے کنوئیں سے کسی حرماں نصیب کی کوئی سسکی اُبھر کر باہر آئی ہو۔اور جب اس نے پشت سیٹ سے ٹکائی اُسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے ہنستے کھلکھلاتے وجود کو کسی نے پل بھر میں توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔اُس کے سارے ارمان کرچیوں کی صورت اُس کے سامنے بکھر گئے ہیں اور اس کے مردہ وجود میں سے ایک آواز نکلی۔

''ہاں زندگی صرف دو اور دو چار کا نام ہے۔''

اِک معجزہ میری زندگی کا

'گڈ ڈے' ایک ایسا افسانہ تھا جو سرا ٹے مارتی تیز ہوا کا وہ بگُھا ثابت ہوا جس نے میری زندگی کے صحرا میں تہہ در تہہ جمے واقعات کے ٹیلے کی بالائی پرتوں کی چند تہیں اُڑا کر ماضی کا ایک اہم باب یادداشتوں کی پٹاری سے نکال کر یوں سامنے کھڑا کر دیا کہ میں نے بھونچکی سی ہو کر دانتوں تلے حیرت واستعجاب سے اُنگلی دبا کر اپنے آپ سے پوچھا تھا کہ میری زندگی کا یہ پہلو کیا اس قابل نہ تھا کہ میں اس پر قلم اُٹھاتی۔ اتنا اہم باب بھلا کیسے نظر انداز ہوا؟

ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا عشق کب شروع ہوا؟ ماضی کو کھنگالنے اور اس میں اوپر نیچے دبی گٹھڑیوں میں پھولا پھرولی سے وہ صبح اپنے تمام تر حُسن و جمال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آگئی تھی، جب موسم کی کافرانہ اداؤں کو دیکھتے ہوئے ہم نصف درجن لفنگی دوستوں کا ٹولہ لٹریچر کی کلاس اٹینڈ کرنے کی بجائے باہر گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ گیا۔ صوفیہ ہماری چھٹی دوست کوئی ماہ بھر پہلے ہمارے گروپ میں شامل ہوئی تھی۔

اُس وقت آسمان بادلوں سے لدا پھندا نیم تاریکی کی علامت بنا دلوں میں حشر سا برپا کیے ہوئے تھا۔ ہواؤں کی لطافت اور اُن کا چُلبلا پن دلوں میں گدگدی سی پیدا کرتا تھا۔ صوفیہ بار بار آہیں سی بھرتی ہوئی کہے چلی جاتی تھی۔

''پکوڑوں سے لطف اندوز ہونے کا اس سے بہتر کوئی موقع ہو سکتا ہے۔''

''چپکی بیٹھو۔خوامخواہ میں دماغ خراب کر رہی ہو۔بھلا کالج آ کر کیسے کہیں جا سکتے ہیں۔جُوتے کھانے ہیں کیا؟''

زمانہ اتنا ایڈوانس نہیں تھا تب۔لڑکیوں کا یوں شتر بے مہاروں کی طرح گھومنا پھرنا انتہائی ناپسندیدہ تھا۔

مجھے یاد نہیں کیا ہوا تھا۔شاید کسی بات پر ہاتھ لہرایا ہوگا۔صوفیہ نے یکدم میرے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر آنکھوں کے سامنے کیا اور صرف چند لمحے اُسے بغور دیکھنے کے بعد گویا ہوئی۔

''کمبخت یہ تو آئن سٹائن کی ماں کہاں سے پیدا ہو گئی ہے؟''

اُس کے چہرے کی سنجیدگی اور اُس کے انداز اس درجہ ڈرامائی سے تھے کہ پورا ٹولہ بشمول میرے سنجیدہ ہو کر اُس کا چہرہ تکنے لگا۔دیکھو! دیکھو! اس کی دماغ کی لکیر۔اُس نے میری ہتھیلی اُن سب کے سامنے پوری طرح کھول دی۔کیسے مشرق کی انتہا سے شروع ہو کر مغرب کی انتہا میں گھُس گئی ہے۔صاف سُتھری گہری اور سُرخی سے بھری ہوئی۔

''ارے گھُنّی کہیں کی؟ تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔بتایا کیوں نہیں اب تک؟ چیختی آوازوں کے ساتھ ایک کے بعد ایک سبھوں کے ہاتھ میری ہتھیلی پر آ گئے۔میں نے اپنا ہاتھ نیچے سے نکال کر پھر اوپر کر لیا۔

صوفیہ بڑی تیز طرار لڑکی تھی۔اسکی ابتدائی سکولنگ جرمنی میں ہوئی تھی جہاں اس کا باپ کونسلر تھا۔

''کمبختو دم تو لو۔بھئی میرا چھوٹا چچا اس علم کا بڑا ماہر ہے۔ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے اکثر و بیشتر مجھے اُن سے تھوڑی بہت جانکاری ملتی رہتی ہے۔وگرنہ مجھے کچھ

اتنا آناوانا نہیں ہے۔ وہ تو اس کی غیر معمولی دماغی لائن نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔''

اُس نے سبھوں کے ہاتھ دیکھے۔ کیا کیا بتایا اب مجھے یاد نہیں۔ پر میری دماغی لکیر نے اُسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''تم سٹوڈنٹ تو کوئی غیر معمولی نہیں ہو۔ پر ایسی لکیر تو جینئس 1.25 ملین سیل کے حامل لوگوں کے ہاتھوں پر ہی ہوتی ہے۔''

سچی بات ہے اُس نے مجھے میری ذات کے ایک پوشیدہ پہلو سے متعلق تحیّر بھرے انکشاف سے دو چار کر دیا تھا۔ اور یہ کیسی عجیب سی بات تھی کہ جب میں اُٹھی مجھے خود میں ایک انفرادیت نما بڑے پن کا احساس ہوا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اس علم کو سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ایک جوانی، شوریدہ سر جذبوں کی فراوانی، اوپر سے کسی خصوصی ٹیلنٹ کی دریافت، آسمان کو ٹوٹنگلی لگانے کو جی مچلتا تھا۔

اب کتابوں کی تلاش تھی۔ اللہ مارے مُنشی عالم اور مُنشی فاضل کی سان پر چڑھے میرے گھرانے میں کتابوں کی یقیناً کوئی کمی نہ تھی۔ چوبی پیٹیوں میں بند کُتب کے خزینوں میں سے اس موضوع پر ایک آدھ نسخے کا مل جانا کوئی مشکل امر نہ تھا۔ ملا۔ پڑھا۔ اپنے ہاتھوں سے موازنے ہوئے۔ بے تکلف رشتہ داروں اور دوستوں پر طبع آزمائی کی۔

پیاس بڑھی۔ اس مخفی علم کے تھوڑے سے اسرار کھلنے پر ھل من مزید کا مطالبہ ہوا۔ کیرو کی Language of the Hand کے بعد اس علم کی Lover نوئل جیکوئن کی Practical Palmistry تلاش کی۔ کومٹ کو پڑھا۔ مطالعہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا ہاتھ قطعی غیر معمولی نہیں۔ بس فنون لطیفہ کی کسی شاخ میں میں تھوڑا بہت نام کما سکتی ہوں۔ فطین لوگوں کی دماغی لکیر کے ساتھ ساتھ بے شمار دیگر علامات کا ہونا ضروری ہے۔

پر اِس انکشاف نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ مجھے چسکہ لگ گیا تھا۔ میری بچتوں کا ایک حصہ میرے اس شوق کی نذر ہونے لگا تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے دہلا دیا۔

یہ جاتی بہاروں کی ہی ایک شام تھی۔ ہم سب میری غلیری چچیری بہنیں اپنے آنگن میں آگ پر ہولیں (کچے چنے کے پودے) بھونتے تھے۔ جب ہماری اماں گھر میں داخل ہوئیں۔ بلند آہنگ آواز میں ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' کہتے ہوئے وہ تیسری بار پھر سبحان اللہ کے ورد کے ساتھ گویا ہوئیں

''مولوی صاحب دُلہن بیاہ کر لائے ہیں۔ مانو جیسے سُلجھے کی لاٹ ہے۔ کمرے میں بیٹھی جگمگ جگمگ کرتی ہے۔''

سیدھی سادی اماں کے چہرے پر حسن کے سحر سے فسوں خیزی، حیرت زدگی اور خدا کی حُسن تخلیق پر عش عش کرنے کا واضح ردعمل تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے ادھیڑ عمر مولوی، صاحب علم، صاحب ایمان اور صاحب کردار انسان تھے۔

میں نے کالک میں لتھڑے اپنے ہاتھ منہ صاف کیے اور اُنکے حجرے کی طرف بھاگی۔ ہمارا گھر ایک ایسے محلے میں تھا جہاں گلیاں دو اطراف سے بند ہوتی تھیں۔ درمیان میں کھلی جگہ کے اطراف میں ساتھ ساتھ جُڑے ہوئے ایسے چھوٹے بڑے گھر تھے جن کے مکینوں میں محبت، پیار، رشک، حسد، نفرت اور لڑائی جھگڑوں کے جذبات کے ساتھ ساتھ کٹوریوں میں سالن کے لین دین بھی بڑے عام تھے۔ ان کی جوان لڑکیاں کدکڑے لگاتیں ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلفانہ آتی جاتیں۔

دہلیز میں میرے قدم جیسے لوہا بن کر مقناطیس کی کسی باڑ پر پڑے اور وہیں چپک گئے۔

سُرخ اوڑھنی میں اُس کے سنہری بالوں میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایسی نیلی، ہری کچھ ور شفاف بولتی آنکھیں کہ جن میں ڈوب جانے کو جی چاہے۔ رعبِ حُسن سے میری بولتی کو اگر سانپ سونگھ گیا تھا تو وہیں میرے دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔

بچپن کی پڑھی گئی سب کہانیوں کی شہزادیاں اور انگریزی ناولوں کی خوبصورت ہیروئنیں اور پرنسیز دماغ کے کونے کھدروں سے نکل کر چوکڑیاں بھرتے ہوئے اپنے آپکو موازنے کے لیے پیش کرنے لگیں۔

میں نے سر جھٹکا اور کچھ جاننے کے لیے پاس بیٹھی۔

''دور، دور، پہاڑ اور چترال۔''

یہ چند الفاظ تھے جو اسکے لعلیں لبوں سے نکلے۔

وہ اور مولوی صاحب چترال سے بھی آگے کوئی ساٹھ میل پرے لٹکوہ وادی کے ایک گاؤں سے تھے۔ تھوڑی سی اور شناسائی ہونے پر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے ابھی ٹوٹا پھوٹا بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ لہٰذا خیریت رہی۔ باڈی لینگوئج سے اُس نے کچھ جاننے کی کوشش کی پر میں نے ٹرخا دیا۔ عام سا ہاتھ تھا کوئی خاص بات مجھے محسوس نہیں ہوئی تھی۔

جلد ہی اُس کی اُردو خاصی بہتر ہوگئی۔ ہمہ وقت محلّے کی عورتوں سے ربط میں تھی۔ ایک دن ایک خوبصورت جوان لڑکا وہاں بیٹھے دیکھا جو اُس کا چچیرا بھائی تھا۔

''اسکا ہاتھ دیکھو۔''

جونہی میں چٹائی پر بیٹھی اُسنے لڑکے کا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ میں اُسوقت بائیس تئیس کے ہیر پھیر میں تھی اور میرا پامسٹری کا شوق جنون میں بدل کر مجھے ہمہ وقت پاگل کیے رکھتا۔

میں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا۔ زندگی کی لکیر تو ٹھیک ٹھاک تھی پر حادثاتی موت کی ایک علامت جسے تھوڑے دن پیشتر میں نے کہیں پڑھا تھا وہاں موجود تھی۔

میں اگر اپنے اُس دور کے شب و روز کا محاسبہ کروں تو یقیناً کہوں گی کہ میں احمق نہیں تھی۔ ماہ و سال کے مطابق ذہنی پختگی بھی تھی۔

تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسکی عمر تھوڑی ہے۔ یقیناً اسوقت میں نیم ملا خطرہ ایمان اور نیم حکیم خطرہ جان کی تفسیر بنی ہوئی تھی اور اپنے اُس محدود سے علم کی خودنمائی کے اظہار کے لیے بےقرار تھی۔ پامسٹری کے بنیادی اُصولوں کو بھول گئی تھی۔ میرے حافظے میں اپنی اس درجہ خوفناک بات یوں بے باکی سے کہہ دینے پر اُن دونوں کے چہروں پر پیدا ہونے والے کسی ردعمل کی کوئی واضح تصویر بھی محفوظ نہیں۔

پھر میرا ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا اور میں وہاں چلی گئی۔ اس شوق کا اظہار وہاں بھی کھل کر ہوا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوسعید چوہدری جو بعد میں بنگلہ دیش کے صدر بھی بنے۔ اُن کا اور شیخ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد دونوں کے ہاتھ میں نے دیکھے تھے۔

جب واپس آئی تو اس پری وش سے ملنے گئی۔ باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ رُکی۔ اُسکے لب و لہجے میں دُکھ اور ملال کا عنصر شامل ہوگیا جب وہ بولی تھی۔

تمہیں یاد ہے میرا وہ بھائی جس کا تم نے ہاتھ دیکھا تھا، مر گیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میرا سانس رُک گیا ہے۔

''کیسے''۔ میں ہکلائی۔

''بس گاڑی چلا رہا تھا۔ ہمارا حد درجہ دشوار گزار علاقہ جہاں آسمان کو چھوتے پہاڑوں کے ساتھ تنگ کچے راستے نیچے گہری گھاٹیاں۔ رگوں میں خون خشک ہوتا ہے ان پر

سفر کرتے ہوئے۔ کہیں لڑھکا اور گاڑی سمیت گہرے کھڈوں میں جا گرا۔''

جیسے کہیں بم پھٹ جائے اور انسان کی دھجیاں اُڑ جائیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہاں سے اُٹھی گھر آئی پر کیسے؟ سارے میں ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ وجود جیسے ملامتی فرقہ بن گیا تھا اور ضمیر نے طعن وتشنیع کے تیر وتفنگ کے مورچے سنبھال لیے تھے۔ اس اس انداز میں گولہ باری ہوئی کہ میں دنوں کیا ہفتوں نڈھال رہی۔ میرے شوق وجنوں کے سارے منہ زور جذبوں کو جیسے کسی نے لگام سی ڈال دی۔

پھر انہی دنوں زندگی میں بڑی دلچسپ سی تبدیلی آ گئی۔ پہلے منگنی بعد میں شادی کے ہنگاموں نے اس حادثے کی تلخی کو کم کر دیا۔ ایک عجیب سی بات کہ میں نے اپنے شوہر کا ہاتھ دیکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی اگر خواہش مچلتی بھی تو لڑکے کی صورت آنکھوں کے سامنے آ کر اُسے گیلا سا کر دیتی۔

بیٹی کی پیدائش نے شب وروز کو بہت مصروف کر دیا۔ دوسرے مہمان کی آمد آمد تھی جب ملک کے نامور دست شناس جناب ایم۔اے ملک کی کتاب ''ہاتھ کی زبان'' مارکیٹ میں آئی۔ ملک صاحب سے میرا عقیدت ومحبت اور احترام کا رشتہ تھا۔ ہاتھ ہمارے درمیان مشترکہ دلچسپی کا موجب تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے سوشل ورک ڈیپارٹمنٹ اور اردو ڈائجسٹ کے دفتر میں میری اُن سے لمبی نشستیں جمتی تھیں۔ کتاب انہوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے بھجوائی۔ اب بھلا مطالعہ کیسے نہ ہوتا؟ تفصیلی ہوا۔

اور ایک خوفناک انکشاف نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

ملک صاحب نے کتاب میں غیر طبعی موت کی آٹھ یا غالباً دس علامات کا ذکر کیا تھا۔ کافی کا مجھے علم تھا پر دو میں نئی دیکھ رہی تھی۔ یونہی میں نے اپنے ہاتھ پر نگاہ ڈالی۔ پل بھر کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں مائینز بچھی کسی زمین پر پڑ گئے ہیں اور زبردست قسم

کےایک جان لیوا دھماکے نے مجھے اُٹھا کر منہ کے بل پھینکا ہو۔

میں نے آنکھیں ملیں ہاتھ کو دوبارہ دیکھا۔میرے ہاتھوں پر اُن میں سے ایک علامت بڑے واضح انداز میں جگمگا رہی تھی۔ میں باہر تیز روشنی میں بھاگی۔ پھر ہاتھ پر نظریں جمائیں۔ ہاتھ کو دیکھا۔کتاب پر نظریں دوڑائیں۔ آنکھیں مل مل کر دیکھا۔پھر بھاگی۔آٹے کے کنستر میں ہاتھ ڈالے۔ پھونک سے فالتو خشک آٹا اُڑایا۔اور ہتھیلیوں کو پوری توانائی سے کھول دیا۔لکیر اور نمایاں ہوگئی تھی۔

یہ صحت کی لکیر تھی۔پامسٹری کے مطابق صحت کی لکیر اگر دل و دماغ اور قسمت کی لکیروں کو کاٹتی ہوئی زندگی کی لکیر کو چھوتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے تو جس مقام پر یہ زندگی کی لکیر کو کاٹے گی وہی ڈیتھ پوائنٹ ہوگا۔بے شک لائف لائن کتنی ہی لمبی، صاف ستھری، گہری اور شوخ کیوں نہ ہو۔

میرے ہاتھ پر میری صحت کی صاف، گہری، شوخ اور لمبی لکیر جس مقام پر میری لائف لائن کو کاٹ رہی تھی پامسٹری کے تعین کردہ وقت کے مطابق وہ پینتیس چالیس سال کا دورانیہ تھا۔

کتابوں کے انبار میں دبی پڑی کیرو اور نوئل جیکوئن کی Secrets of Hand Reading نکالیں۔یہ علامت اُن میں موجود تھی اور یہ میرے ہاتھ پر بھی موجود تھی۔

میں حیران تھی یہ علامت اس سے پہلے میری نظروں سے کیوں نہیں گزری؟ مجھے اپنی قابلیت کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔پر اب میں اس میں اتنی کمزور بھی نہیں تھی۔ مجھے یاد تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں وی سی ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے کسی فنکشن میں آئے تھے۔فیکلٹی ممبرز اُن کے ساتھ کھڑے تھے جب میں اُن کے پاس گئی۔ میں نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور رینگہ میں

کہا۔

''سر مجھے آپ کا ہاتھ دیکھنا ہے۔وقت آپ نے بتانا ہے۔کب آپ کے پاس آؤں؟''

انہوں نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔اُس وقت میرے تن پر آبی رنگی ٹنگائیل کی خوبصورت ساڑھی تھی۔شانوں پر گھنے سیاہ بال پڑے تھے اور سانولی رنگت کے ساتھ میں مکمل ایک بنگالی لڑکی نظر آتی تھی۔میرے ہیڈ سر نے مُسکراتے ہوئے پہلے مجھے اور پھر وی سی ابو سعید چوہدری کو دیکھا اور میرا تعارف ویسٹ پاکستانی سٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔

یونیورسٹی لیول کے اساتذہ اور سٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والی لطیف سی چھیڑ چھاڑ اور جُملہ بازی والے ماحول کے درمیان بالآخر میں نے اُنہیں رضامند کرہی لیا۔

اُنکے ہاتھ کے پرنٹ لینے اور اُنکے نتائج کے بارے میں تفصیلی بتانے کے عمل میں انہوں نے غایت دلچسپی اور حیرت سے سب کچھ سُنا اور جواباً مسکراتے ہوئے طنزاً کہا۔

''جو گزرا ہوا بتایا گیا وہ بہت حد تک درست ہے اور جو کل کے بارے میں خوشخبری منتظر ہے اُس کا ویسٹ پاکستان کے ساتھ رہتے ہوئے تو حصول ممکن نہیں۔ہاں البتہ اگر آزاد ہوئے تو پھر دیکھیں گے۔

ایسے طنز بھرے جملے سُننا اور انہیں دُکھی دل کے ساتھ ہضم کرنا اب میرا معمول بن گیا تھا۔پر جب وہ بنگلہ دیش کے صدر بنے میرا جی چاہا تھا انہیں تار بھیجوں اور پوچھوں کہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی وہ لڑکی یاد آئی تھی جس نے اُنہیں مستقبل قریب میں کوئی بہت اہم ذمہ داری سنبھالنے کی نوید سنائی تھی۔

مارشل لا بھی تھا اور آرمی انٹیلی جنس کے افسر بھی عام کپڑوں میں ملبوس یونیورسٹی

کے نواح میں منڈلاتے رہتے۔پھر بھی شیخ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد رقیہ ہال میں آگئی تھی۔ میں نے تو اُسے ایک چٹھی ڈال کر ہاتھ دیکھنے کی استدعا کی تھی پر اُس نے مجھے تین چار چٹھیاں ڈالیں۔چار چکر میں نے دھان منڈی اُس کی رہائش گاہ کے لگائے اور اُسے بہت سی باتیں بتائیں جن کی آنے والے وقتوں میں تصدیق بھی ہوئی۔اور جب اُسکا خاندان کٹا مرا۔اس پر کسی ملال یا دُکھ کی بجائے مجھے اپنے علم کے سچ ثابت ہونے کی خوشی تھی۔

اب ذرا پل بھر کے لیے اس صورت حال کے قلب میں جھانک کر سوچیے تو سہی۔

کو زندگی کے دُکھ اور تلخیاں بسا اوقات وقت اور ساعتوں کو بہت بوجھل بنا دیتی ہیں پر اس کی خوبصورتیاں،اس کی رعنائیاں ناڑو کی طرح جُوے اس کے رشتے،انکی محبتیں، نفرتیں اسکی گہما گہمیاں سب دامن دل کو کھینچتی ہیں۔خود کو توپ چیز سمجھنے اور بلندیوں پر کمندیں ڈالنے کے عزائم رکھنے والے کو ایکا ایکی احساس ہو کہ زندگی کا پٹاخہ چل گیا ہے اور سارے منصوبوں اور ارادوں کی ہوا سے بھرا ہوا غبارہ موت کی نوکیلی سُول کے ایک ہی ہلے سے پچک کر لجلجی شکل میں باقی ہے۔

دو سالہ پیاری سی بیٹی میرے سامنے تھی۔ پیٹ میں ایک نیا وجود کدکڑے لگاتا تھا۔میرے سامنے نہ شوہر تھا نہ گھر۔میرے بچے،ماں کے بغیر بچے،جیسے میرا کلیجہ پھٹا اور آنسو یوں بہے جیسے صحت مند بکرے کی گردن پر پوری طاقت سے چھری چل جائے اور خون کے فوارے اُبل پڑیں۔

دل کا موسم ہی باہر کے سارے موسموں کی جان ہے اس کا صحیح ادراک ہی اب ہوا تھا۔آسمان کی نیلاہٹیں،درختوں کے ہرے کچور رنگ،پھولوں کی خوشبوئیں،خلقت کی ہماہمی اور نفسانفسی سب جیسے گھنیری اُداسیوں میں لپٹ گئے تھے۔ہر چیز کا حُسن ماند اور سب کچھ بے معنی سا ہو گیا تھا۔

سوچا۔ایم۔اے ملک کے پاس جاؤں۔شاید کہیں کوئی نقطہ، کوئی مربع نمانشان، کوئی مدھم سی مثلث، کوئی ستارہ، کوئی مچھلی کا نشان، کوئی تقویت دیتی لائن جو میری نظر سے اوجھل ہو۔پر جیسے میرا اندر کسی ایسی موہوم امید پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا، کہ طاقتور مائیکروسکوپ نے ہاتھ کے چہرے کا ایک ایک نقش اُجاگر کر رکھا تھا۔

بایں ہمہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ''شاید'' آس کی ننھی منی کرن کی صورت میں بھی موجود تھا۔

اُن دنوں ایم۔اے ملک صاحب نے گڑھی شاہو میو روڈ پر ایک کمرشل بلڈنگ خریدی تھی اور وہ شام کو وہیں بیٹھا کرتے تھے۔آنسو بھل بھل کرتے میری آنکھوں سے بہنے لگے تھے جب میں نے اُنہیں تفصیل سنائی۔

''ارے ارے محبت بھرا دلاسہ تھا۔چلو دیکھتے ہیں۔گھبراتی کیوں ہو؟''

انہوں نے ہاتھ کا پرنٹ لیا اور تین دن بعد اپنے یونیورسٹی والے گھر میں ہی آنے کا کہا۔ساتھ میں بچی کو لانے اور شام کی چائے اُن کے ساتھ پینے کی بھی تاکید ہوئی۔

مقررہ دن میں نے چادر اوڑھی اور اکیلی بس میں بیٹھ اُنکے گھر چل دی۔یہ دن جیسے سُولی پر کٹے تھے۔چہرہ دنیاداری والی مسکراہٹ اور اندر گھائل، روتا اور بین ڈالتا ہوا۔

پر جب انکے گیٹ پر کھڑی بیل پر ہاتھ رکھنے ہی والی تھی، کہیں میرے اندر سے آواز آئی۔

اور اگر انہوں نے تمہارے اس خدشے کی تصدیق کر دی تو کیا کرو گی؟ تمہیں خدا پر بھروسہ نہیں کہ وہ تقدیروں کو بدلنے پر قادر ہے۔

میرے اندر جیسے طوفان سا آ گیا۔گھنٹی بجانے کی بجائے میں یونیورسٹی کی طرف مُڑ گئی۔پاؤں میں جیسے پہیے سے لگ گئے۔کسی تنہا گوشے کی تلاش مجھے اُڑائے لیے جا رہی

تھی ۔اُن دنوں آج جیسا رش نہیں تھا ۔رہائشی گھروں اور یونیورسٹی کے درمیان ایک سنسان جگہ پر میں ڈھیر ہوگئی تھی ۔کتنی دیر سجدے کی یہ صورت رہی ۔کتنا آہوں اور آنسوؤں کا طوفان بہا ۔یہ سب یاد نہیں ۔ہاں کچھ اگر یاد ہے تو بس اتنا کہ جب ہوش آیا اور سجدے سے سر اُٹھایا تو سرمئی سا اندھیرا فضا پر چھا رہا تھا۔

میں گھر آ گئی تھی ۔مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جلتے زخموں پر کسی نے ٹھنڈے ٹھار پھاہے رکھ دیئے ہیں ۔

تین سال تک میں کانٹوں بھری صلیب پر چڑھی رہی ۔

تقدیر اٹل ہے ۔لکھا ہوا نہیں ٹلتا۔ ہونی ہو کر رہتی ہے ۔جیسے الفاظ کہیں پڑھتی یا سُنتی تو جیسے وحشت یوں طاری ہوتی کہ آگ لگ جاتی ۔کوٹھے کے بیروں کو چھوتے شعلے جیسے سب کچھ جلا کر خاکستر کرنے پر مائل ہو جاتے ۔گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ۔باہر نکل جاتی ۔ گھر سے دور کسی ویران سے پارک کے کسی کنج میں بیٹھ جاتی ۔نگاہیں فضائے بسیط کی لامحدود وسعتوں کی جانب اُٹھتیں اور میں شکست خوردہ آواز میں اُس سے مخاطب ہوتی ۔

’ٹُنڈا ہے تو ۔لنگا لولا ہے ۔قلم ٹوٹ گیا ہے تیرا ۔سیاہی خشک ہوگئی ہے ۔اتنا مجبور اتنا بے بس ۔کیسا رب ہے تو ۔ایسے مجبور اور بے بس رب کو میں تو نہیں مانتی ۔

پھر جیسے دریا میں طُغیانی آ جائے ۔میری آواز گلوگیر ہو جاتی ۔سارے جہاں کی چاہت اور محبت لہجے میں اُمڈ آتی ۔ارے میرا رب تو جہانوں کا بادشاہ، کائنات کا مالک، لوح و قلم کا وارث ۔میں اُس کے دروازے سے خالی ہاتھ جاؤں ۔نہیں نہیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے ۔میرا سارا وجود جیسے مجسم نفی ہو جاتا ۔مُو مُو میں سے نہیں نہیں کی آوازیں اُٹھتیں ۔ سسکیوں سے جسم لرزتا تڑپتا ۔گھنٹوں گزر جاتے ۔پھر جب اُٹھتی تو یہ ضرور کہتی ۔

تو نے اگر مجھے زندگی دان پن نہ کی تو یہ تیرے لیے بھی کس قدر شرمندگی کی بات

ہو گی؟ پھر دھیرے دھیرے جیسے اُس کا احساس اُس کا خیال میرے اندر کسی وجود کی طرح حلول کرتا گیا ۔میں محفل میں ہوتی اور پل بھر میں غائب ہو جاتی ۔اُس کے پاس پہنچ جاتی ۔یا اُسے اپنے پاس بٹھا لیتی اور اُس سے باتیں شروع ہو جاتیں ۔اُس نے ایک ایسے محبوب کا روپ دھار لیا تھا ۔جو میرے ہر احساس پر حاوی ہو گیا تھا ۔

ٹیگور کے گیت ۔حافظ اور اقبال کی شاعری ۔فلمی گانے سبھوں میں میں اُسے فوکس کر لیتی ۔روٹھے ہو کیوں؟ تم کو کیسے مناؤں پیا؟ بولو نا ۔ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور کپکپاتے ہونٹ دُہراتے ۔بولو نا ۔بولو نا ۔

باغوں کے ویران کنجوں سے اُٹھ کر میں وطن کے دور دراز دشوار گزار حصوں کی طرف دوڑنے لگی تھی ۔لکھنا بھی مقصود تھا اور اُسے دیکھنا بھی ۔جی بھر کر اُسے دیکھا، سراہا، نئی جگہوں پر ماتھا زمین پر رکھا، اور خوب لکھا ۔

اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا ۔میرے بچے بڑے ہوتے گئے ۔میں زندگی کی طرف پوری توانائی سے لوٹی تھی ۔پامسٹری سے متعلق ساری کتابیں میں نے تلف کر دی تھیں ۔ہاتھ دیکھنا بند تھا اور اس تابوت میں آخری کیل میں نے اُس دن ٹھونکی جب میں ایک تقریب میں جناب ایم ۔اے ملک سے ملی ۔وہ آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کر مہینوں زیر علاج رہے ۔میں نے اُن سے پوچھا تھا ۔

''ملک صاحب اس بیماری سے متعلق کبھی کوئی لکیر آپ نے اپنے ہاتھوں پر دیکھی ہو ۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے ۔سوچتے رہے پھر جیسے مدھم سی آواز میں بولے ۔

''کچھ ایسی خاص مجھے نظر نہیں آئی تھی ۔ہاں البتہ آشوتوش پنڈت اوجھا کی کتاب پر ایک جگہ میں نے نشان دہی کی تھی کہ مجھے اپنے ہاتھ پر ایسی مدھم سی لکیر کا شائبہ پڑتا ہے ۔

میرے پاس پنڈت آشوٹوش کی Palmistry for all تھی اور میں نے اُسے پڑھا تھا۔

مجھے رب العالمین کا صحیح مفہوم و ادراک کینڈی (سری لنکا) کے Tooth Relic ،امرتسر کے گولڈن ٹمپل، اسکدار میں یہودیوں کے سینا گاگ (synagogue)، قاہرہ کے شہرہ آفاق Hanging چرچ اور مسلمانوں کے حرم میں جا کر ہوا۔ رب کو اپنی دنیا کے مختلف النوع مذاہب اور نسلوں کی رنگا رنگی بہت محبوب ہے۔ اس کی مخلوق اپنے اپنے دُکھوں اور پریشانیوں کی گٹھڑیاں اپنے مونڈھوں پر دھرے واویلا کرتی، اُسے پکارتی، دُکھڑے سناتی اور اپنی اپنی تعمیر کردہ عبادت گاہوں میں کس کس انداز میں اُسے یاد کرنے اور منانے میں سرگرداں ہے۔

اور صرف وہی اُن کے بہتے آنسوؤں کو پونچھنے، ان کے رستے زخموں پر پھاہے رکھنے کی قدرت رکھتا ہے کیونکہ وہ سزاوارِ خدائی ہے۔

اور ہاں کہانی کا معجزاتی انجام بھی تو سُن لیجیے کہ میری وہ صاف سیدھی لمبی اور شوخ سی لکیر پہلے درمیان سے ٹوٹی پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں فاصلہ پیدا ہوا۔ آج وہ مجھے بتاتی ہے کہ خدا دعاؤں کا سننے والا ہے اور تقدیریں بدلنے پر قادر ہے۔

لب کھولے ہیں

اب اماں کو یہ سمجھانا کس قدر دُشوار تھا کہ کرنل اقبال بہنوں کے معاملے میں قطعی لاپرواہ نہیں۔ رشتے ناطے گھروں میں اُگے پیڑوں پر لگے پھلوں کی طرح نہیں کہ جنہیں جب جی چاہا توڑ کر جھولی میں ڈال لیا۔ یہ تو خدائی فیصلے ہیں جو آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔

پر بڑے تھال میں دال بینتے ہوئے اماں نے لمبا طنزیہ ہنکارہ بھرا اور بولیں۔

''ان تاویلوں سے مجھے مت بہلاؤ۔ جانتی ہوں میں سب۔ ارے اتنے نگوڑے فوجی افسر اُس کے ماتحت ہیں۔ یہ کسی سے کہہ سُن نہیں سکتا۔''

کرنل اقبال کی بیگم ان دنوں گھر آئی ہوئی تھیں اور اس وقت برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ساس کی باتیں سُن کر ''اماں'' کہہ کر اُس نے کچھ کہنے کو زبان کھولی پر باورچی خانے کی دیوار سے لگی کھڑی عائشہ نے انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ کر سر کو ہلاتے ہوئے نفی کا اشارہ دیا۔

دُلہن کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ''اماں'' بس کافی تھا۔ اماں تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔

''جو لوگ رشتوں کے لیے رابطہ کرتے ہیں وہ ہماری ذات برادری کے نہیں

ہوتے ہیں اور آپ ذات پات سے ہٹ کر کچھ سوچنے کو تیار نہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا دُلہن تم۔ ارے زمانے میں کیا قحط پڑ گیا ہے؟ اتنی لمبی چوڑی برادری ہے ہماری عائشہ اور زبیدہ کے لیے لڑکوں کا ملنا جوئے شیر لانے والی بات ہوگئی ہے۔ بڑا بھائی تو باپ کی جگہ ہوتا ہے اُسے نیند کیسے آتی ہے؟ گھر میں دو جوان بہنیں بیٹھی ہیں۔''

زبیدہ سٹور سے نکل کر بھاوج کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور دھیرے سے بولی۔

''پلیز بھابھی جان کچھ بولنا مت وگرنہ اماں ابھی حشر کردیں گی۔''

اِس بار بیگم اقبال کھاریاں گئیں۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ لان میں گلاب کے پھولوں نے فضا کو حسین بنا رکھا تھا۔ دھوپ میں خوشگوار سی حدت تھی۔ بچوں نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور اُسے لان میں گھسیٹ لائے۔ اقبال نے ماں بہنوں کے بارے میں پوچھا اور بیگم جیسے پھٹ پڑیں۔

''اقبال خدا کے لیے عائشہ کے بارے سنجیدگی سے سوچیئے۔ دوڑ دھوپ کیجیے۔ لوگوں سے کہیے سُنیے۔ شرم کے جس خول میں لپٹے ہوئے ہیں اُسے اُتار دیجیے ورنہ اماں آپ کے اور میرے سر پر ایک بال نہیں چھوڑیں گی۔''

''کیا کوئی بات ہوئی وہاں؟'' کرنل اقبال کی فراخ پیشانی اور چمکدار آنکھوں میں تفکر جیسے شفاف آسمان پر آناً فاناً چھا جانے والی کسی بدلی کی طرح اُتر آیا۔

تفصیلات میں پڑنے سے کوئی خوشی تو ملنے سے رہی۔ بس دعا اور کوشش کریں۔

بیٹ مین تازہ ڈاک اور تازہ کٹی ہوئی مولیاں لے کر آیا۔

''ارے یہ اپنے گھر کی ہیں۔'' بیگم اقبال خوشی سے چہکیں۔

''جی ہاں کھا کر دیکھیے۔ کتنی میٹھی ہیں؟'' بڑی بیٹی نے جواب دیا۔

چھوٹے بچوں نے باپ کے ساتھ چہلیں کرنے کی کوشش کی مگر ماں نے انہیں

آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ باز رہو۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ کرنل اقبال متفکر سے ہیں۔

شرافت، خاندانی وقار اور بھرم کے لبادے میں لپٹا کرنل اقبال جو بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اپنے شانوں پر بہنوں کی ذمہ داریوں کا بار پوری طرح محسوس کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ماں کو سمجھانے اور ماں سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس وقت افسردہ اور متفکر خود سے اُلجھے جانے کن خیالوں میں گُم بیٹھے تھے؟

یہ چند دنوں بعد کی بات ہے جب کرنل اقبال ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر میں داخل ہوئے بیگم سے ٹکراؤ کوریڈور میں ہوا۔ اُس نے شوہر کا چہرہ دیکھا جو اندرونی مسرت سے دمک رہا تھا۔ وہ رُکی اور بولی ''کوئی اہم بات۔''

بیگم چار بچوں کے باوجود بڑی دھان پان سی تھیں۔ سینے تک بمشکل پہنچتی تھی۔ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کرنل اقبال نے مسروری آواز میں کہا۔

''آج صبح سو کر اُٹھا۔ لان میں گیا تو دیکھا کیاریاں سُرخ گلابوں سے دمک رہی ہیں۔ بس جیسے چھٹی حس نے کہا۔ آج کوئی خوشی کی خبر ملے گی۔

''اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ عائشہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا سول انجینئر ہے۔ لندن میں کام کرتا ہے۔ اپنی برادری کے لوگ ہیں۔ عائشہ کولڑکے کی ماں بہنوں نے دیکھا ہے اور بہت پسند کیا ہے۔ لڑکے کا باپ زبیر کے ساتھ آیا تھا۔ وہ رشتہ میں زبیر کا چچا لگتا ہے اور تم تو جانتی ہی ہو زبیر پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے جتنا خود پر۔''

''اور اب سنو دوسری خوشخبری۔''

بیگم کو انہوں نے بازوؤں کے ہالے میں لے لیا اور قدم ڈریسنگ روم کی طرف بڑھا دیئے۔

''اب بتا دیجیے نا۔''

''کھانے کی میز پر۔بھوک زوروں پر ہے۔''

کھانا شروع ہو گیا تھا پر میاں خاموش تھے۔بیگم کا مارے اشتیاق کے بُرا حال تھا۔

''اللہ اب بتا دیجئے نا۔خوشخبری کا کچومر نکالنا ہے کیا؟''

''مجھے ملٹری اتاشی بنا کر ٹرکی بھیجا جا رہا ہے۔''

کرنل اقبال اپنی رو میں تھے شاید اسی لیے انہوں نے بیگم کے چہرے پر کھلنے اور ہونٹوں پر سجنے والی خوشی کو اس میں مدغم کرنے کی کوشش نہیں کی جو ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔وہ بول رہے تھے۔

امریکہ سے واپسی پر میں نے ایک پورا ہفتہ صرف استنبول میں گزارا تھا۔تم چاندنی راتوں میں باسفورس کے ساحل کو دیکھنا،سرو اور صنوبر کے جھنڈ، روشنیاں اور خوشبوئیں۔تم اُٹھنا چاہو گی تو اُٹھ نہیں سکو گی۔میں نے سارا ٹرکی دیکھا ہے۔پر استنبول کی بات ہی دوسری ہے۔

کرنل اقبال خوش تھے تو اماں جی کا پاؤں بھی زمین پر نہ ٹکتا تھا۔کسی نے کہا۔

''ارے سات سمندر پار چلی جائے گی۔''

اور اماں بھڑک کر بولیں۔

''ایسا مت کہو۔بیٹی سکھی رہے۔سات سمندر کیا ستر سمندر بھی ہوں تو کوئی بات نہیں۔'' عائشہ کا جی ہول کھاتا تھا۔نکاح ٹیلی فون پر ہونا طے پایا تھا۔بھلا ایسی روکھی پھیکی شادی کا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔دھوم دھڑکے سے بیاہ ہو تو مزہ ہے۔پر اب کیا ہو سکتا تھا؟ پڑھی لکھی،اپنی ایک رائے رکھنے، جی دار اور حوصلہ مند لڑکی ہو کر بھی اُس نے اِن معاملات میں سر جھکانا بہتر سمجھا تھا۔یوں ماں کی مجبوریاں بھی اس کے مدنظر تھیں۔

بری کے جوڑے اور زیورات شاندار تھے۔ نکاح مقررہ دن اور مقررہ وقت پر ہوا۔ دولہا کی بڑی سی تصویر برآمدے میں رکھ دی گئی تا کہ دُلہن کے عزیز و اقارب دُولہا کا دیدار کرسکیں۔ عائشہ نے بھی یہی تصویر دیکھی تھی۔ یقیناً یہ ایک وجیہہ نوجوان کی تھی جس کی آنکھوں سے ذہانت اور شوخی ٹپکتی تھی۔

اور نکاح کے پورے ایک سال بعد وہ سبز اور سفید پروں والے بوئنگ میں بیٹھی انگلینڈ جارہی تھی۔ پاسپورٹ اور ویزا تو جلدی بن گئے مگر وہ لوگ نعیم کی طرف سے ٹکٹ اور بُلاوے کی تاریخ کے منتظر رہے۔ جب اس میں طوالت ہوئی تو کرنل اقبال نے ٹرکی سے ٹکٹ کا بندوبست کرکے ماں بہن کو اطلاع دی۔ دوسری طرف نعیم کو بھی مطلع کردیا۔

سائپرس اور سوئزرلینڈ کے اُوپر سے گزرتے ہوئے اس کا دل دھڑکا۔ انجانی زمین سے وہ کتابی حد تک روشناس تھی۔ تاریخ انگلستان جس کی کنواری ملکہ الزبتھ سے اُسے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ جارجوں اور ہنریوں کے ادوار سے اُسے شدید چڑ تھی۔ پر ملکہ الزبتھ جن صفحات میں قید تھی وہ ہاتھوں سے مانوس ہو گئے تھے یا یہ دلی تعلق تھا کہ جب بھی کتاب کھولتی ملکہ الزبتھ ہی سامنے آتی اور اب وہ اس کے پایہء تخت لندن کی طرف رواں دواں تھی۔ دھند اور کہر کا مارا لندن جس کے بارے میں اُس نے بہت کچھ پڑھا تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ سامنے کوئی آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ نعیم اسے نکاح کے بعد خط لکھتا تا کہ وہ اس کی تحریر سے اُس کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت جان جاتی مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ اپنے منہ سے کسی کو کیا کہتی؟ چپ رہی۔ البتہ جب بلاوے کے لیے تاخیر ہونے لگی تو وہ اندیشوں میں گھر گئی مگر یہ بھی سوچتی کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کو جو عرصے سے دیارِ غیر میں رہ رہا ہے اور کسی کے زیر اثر نہیں اُسے ایک لڑکی کی زندگی سے کھیلنے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ ایک پڑھا لکھا انسان اتنا بڑا دھوکہ اور فراڈ نہیں کرسکتا۔

مگر سوچوں کے ناگ ایسے زہریلے تھے کہ کاٹے بنا انہیں چین نہیں پڑتی تھی۔
ایک سوچ کا زہر ختم ہوتا تو دوسری کا شروع ہو جاتا۔

اُس کا دُلہنوں والا کوئی انداز نہ تھا۔ سادہ لباس، لمبے بال چوٹی میں گندھے ہوئے ، ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں، کلائی میں چار چوڑیاں اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے گول رنگ۔
یہ تھی عائشہ احمد۔ بی۔ ایس سی بی ایڈ۔

''بعض اوقات نئی جگہ پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گھبرانا نہیں۔ ایک بات یاد رکھنا مرد کیسا بھی سرکش، باغی اور لاپرواہ کیوں نہ ہو پیار کا بھوکا ہوتا ہے۔ پیار اُسے راہ راست پر لے آتا ہے۔ اپنے مرد سے پیار کے اظہار میں بخیلی نہ کرنا۔''

اور جب اس نے قدم اُٹھائے۔ اماں کی آواز سنائی دی۔

''خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میری بچی تو سدا پھلے پھولے۔''

پھر کپتان نے لندن پہنچنے کا مژدہ سنایا۔

جہاز رُکا۔ ٹرمنل سے لاؤنج میں جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تیز روشنیوں میں نہاتی کارڈیگن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ دائیں بائیں مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگوں کو ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

اجنبی لڑکی جو پہلی بار کسی غیر ملکی سفر پر نکلی تھی نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں اور کس کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہو کر کیا کیا کرنا ہے؟ وہ پوچھ پوچھ کر چیکنگ کے مختلف مرحلوں سے گزری۔

اور اب سامان زمین پر رکھے باہر کھڑی تھی۔ فضا پر گھٹا ٹوپ بادلوں کا راج تھا۔ یخ بستہ ہوائیں برچھی کی سی کاٹ لیے تھیں۔ اس کے قدم ڈگمگائے تھے اور دل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔ اُس کی آنکھوں نے چہار سو دیکھا تھا۔ وہاں وہ چمکتی شوخ آنکھوں والا چہرہ

کہیں نہیں تھا۔ جسے وہ سال بھر سے تصویری پیرہن میں دیکھتی آ رہی تھی۔ نئی نویلی دُلہن کے سارے جذبات جن سے وہ شریک زندگی کا استقبال کرنا چاہتی تھی بُجھ سے گئے تھے۔ اندیشے اور وسوسے لپیٹ میں لینے لگے۔ پھر جیسے ایک محبت بھری آواز کی بازگشت سنائی دی۔

''گھبرانا نہیں۔ میں نے نعیم کو بار بار یہ بتایا ہے کہ تم گھر سے پہلی بار اتنے طویل سفر کے لیے نکل رہی ہو۔''

کہیں آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح چمکے، جنہیں اُس نے فی الفور پلّو سے صاف کرتے ہوئے خود سے کہا۔

''یوں بھلا بات بنے گی۔ حوصلے اور جی داری کی ضرورت ہے۔''

ٹیکسی میں بیٹھی وہ ماربل آرچ کی طرف جا رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور خاصا باتونی لگتا تھا کئی باتیں پوچھ چکا تھا اور بہت سی پوچھنا چاہتا تھا۔ پر وہ تھی کہ اس وقت بات کرنے کے قطعی موڈ میں نہ تھی۔ ڈوبتے اُبھرتے دل کو تسلی کے پیرہن پہنا رہی تھی۔

رات ابھی جوان تھی۔ پہلا پہر تھا۔ سڑکیں روشن تھیں۔ ٹیکسی اجنبی راستوں اور اجنبی لوگوں کے درمیان سے بھاگتی جا رہی تھی۔

''تمہارے شوہر کا گھر بہت پرسکون اور خوبصورت جگہ پر ہے۔ ماربل آرچ میں لندن کی اعلیٰ جینٹری رہائش پذیر ہے۔'' اُسے اپنے بھائی کی باتیں پھر یاد آئیں۔

پھر وہ سیڑھیاں چڑھتی گئی اور بالآخر اُس فلیٹ کے سامنے پہنچ گئی جس کے بارے میں ابھی ابھی ایک خوبصورت سے نوعمر لڑکے نے گراؤنڈ فلور پر اُسے ساری تفصیل سے آگاہ کیا تھا کہ نو نمبر کدھر ہے اور اُسے کس سمت سے سیڑھیاں چڑھنی ہیں؟

اس نے دھڑکتے دل سے بیل پر انگشت شہادت رکھ دی تھی اور بس۔ بیل بج

اُٹھنے اور دروازہ کھلنے میں لمحے کا توقف تھا۔ کاغذی پیرہن گوشت پوست کے وجود میں اس کے سامنے تھا۔

تعارف کروانے کی یقیناً کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن عائشہ کو اُن آنکھوں میں کسی قسم کا کوئی ہیجان محسوس نہیں ہوا تھا اسی لیے اس کے پپڑیاں جمے ہونٹوں سے بمشکل نکلا تھا۔

''میں عائشہ احمد ہوں۔ لاہور سے آرہی ہوں۔''

وہ ملاقاتی کمرے میں صوفے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ گھر میں لذیذ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کھانا پک رہا تھا۔ اس کے بالمقابل وہ شخص کھڑا تھا جو اس کا شوہر تھا جسے وہ سال بھر سے اپنے خوابوں میں سجائے چلی آرہی تھی۔ چپ چاپ خجالت زدہ سا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گھر آئی تھی۔ اپنے شوہر کے پاس آئی تھی مگر استقبال کا یہ انداز نرالا تھا اور واقعات کے تسلسل نے اُسے وہ سب کچھ سمجھا دیا تھا جسے وہ اب تک واہمے اور اندیشے سمجھ کر جھٹلاتی آئی تھی۔ تھکی ہوئی آنکھوں کو اس نے بائیں ہاتھ کی پوروں سے مسلا اور اپنے آپ سے کہا۔

''مقدر کا یہ وار کتنا کڑا ہے؟ پروردگار مجھے حوصلہ دے۔''

اس نے سُرخ قالین پر بنے ہوئے سیاہ پھولوں کو دیکھا۔ عالیشان آراستہ پیراستہ کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ لمبا سانس لیا تھا۔ اس لمبے سانس میں شکست اور ہار کا گہرا کرب تھا۔

اب وہ منتظر تھی کہ کب ایک گوری میم گھر کے کسی کمرے سے نکل کر آتی ہے، پر آئی تو ایک ایسی عورت جو اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھی۔ چھریرے قد کی اُجلی رنگت والی، پیشانی پر بندیا سجائے، شانوں پر بھاری سے جوڑے اور جسم پر کاہی رنگی ساڑھی لپیٹے۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور صوفے کے پاس کھڑے نعیم کو استفہامیہ نظروں سے گھورا اور

اب اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

''یہ عائشہ احمد ہے اور یہ مدھو ہے۔''

تعارف مکمل ہو گیا پر اس کے خیال کے مطابق ادھورا تھا۔ وہ عائشہ احمد ہے تو کون ہے؟ اور اگر وہ مدھو ہے تو اس گھر میں کس حیثیت سے براجمان ہے؟

''میں کھانا لگاتی ہوں۔ بھوک لگ رہی ہو گی۔'' اس نے ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے غالباً کچن کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

اس کا جی چاہا اس پانچ منزلہ فلیٹ کی بالکونی سے گر کر اپنے آپ کو پل میں ختم کر ڈالے۔ کیا کرے؟ اپنے آپ پر ہنسے یا روئے۔

پھر وہ بھی اُٹھ کر اندر کسی کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ تنہا تھی۔ اجنبی دیس کے اس اجنبی گھر میں جسے وہ اپنا سمجھ کر کوسوں دور سے آئی تھی۔

''زندگی کی بساط پر یہ بازی میں کھیلے بنا ہار گئی ہوں اور مجھے اپنی اس ہار پر جینا ہے۔ ہمت والے لوگوں کی طرح۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

دو ہی تو باتیں اس نے اماں سے سیکھی تھیں۔ حوصلہ اور ہمت۔ اماں جیسی باعزم اور عالی حوصلہ عورت کہیں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے۔ بھرپور شباب کی بیوگی، اس پر جھلملاتا جگمگاتا حُسن اور جائیداد کے بکھیڑے، پر مجال ہے جو کبھی پیشانی پر ڈر اور خوف سے 'ہائے' کی آواز بھی سُنی ہو۔ مردوں کی طرح رعب دوب والی آواز جس کی ایک کڑک اچھے اچھوں کو دہلانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

وہ خاموش طبع تھی مگر سخت جان اور سخت دل مشہور تھی۔ چھوٹی موٹی باتیں عائشہ کو کبھی پریشان نہیں کرتی تھیں۔ بڑی باتوں کو بھی وہ جی داری سے سہہ جانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ وہ صوفے سے اُٹھ گئی تھی۔ باتھ روم اس نے خود ہی تلاش کر لیا۔ اندر گئی۔ منہ ہاتھ

دھویا۔ یہاں لمبے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے اپنا سراپا دیکھا۔ دو آنسو ٹپ سے آنکھوں سے گرے اور فرش پر کہیں گم ہو گئے۔

جب قسمت بٹتی تھی تو میں کیا سو رہی تھی؟ ایسا کھوٹا مقدر لے کر دنیا میں آئی ہوں۔

چھپ چھپ پانی کے چھینٹے اس نے اپنے چہرے پر مارے اور ڈوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتی باہر آ گئی۔

کھانے کو کب جی چاہ رہا تھا؟ کلیجہ تو جیسے کٹ رہا تھا۔ پر کمزوری کا اظہار اور وہ بھی نعیم احمد جیسے بے اصول انسان کے سامنے اسے کسی طور بھی گوارا نہ تھا۔ وہ کھانے کی میز پر آئی اور ان دونوں کے سامنے بیٹھی۔ میز پر نظریں دوڑائیں۔ اس پر سجے کھانے خوش رنگ تھے۔ وہاں ترتیب اور سلیقہ تھا۔ چکن کری کا ڈونگا اس نے اُٹھایا۔ تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈالا، سلاد لیا تھوڑے سے چاول پلیٹ میں اُنڈیلے اور کھانے لگی۔ کھانا خوش رنگ ہی نہیں خوش ذائقہ بھی تھا۔

''میرے پاس سب گند ہتھیار ہیں۔ ان تیز اور نوکیلے ہتھیاروں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ سب محاذ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایسے میں پیچھے ہٹنا بہتر نہیں کیا؟ یہ شکست ہے میرے مقدر کی۔''

آنسو آنکھوں میں اُمڈ آئے تھے اور نوالے حلق میں گولے بن کر پھنسنے لگے تھے مگر وہ کمال حوصلے سے آہستہ آہستہ گولوں کو نیچے اُتارتی گئی اور کھارے پانی کو واپس اپنی جگہ جانے کا کہتی رہی۔

اور جب وہ تینوں اُٹھ کر نشست گاہ میں کافی پینے کے لیے آئے۔ وہ بڑے صوفے کی سائیڈ پر بیٹھ گئی اور کافی کا مگ اُس کے گورے ہاتھوں سے اُس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ گھونٹ بھرا اور نعیم احمد کی طرف دیکھتی ہوئی آہستگی سے بولی۔

''آپ کی یا آپ کے خاندان کے کسی فرد کی مجھ سے یا میرے گھر والوں سے کبھی کوئی دشمنی رہی ہو؟'' سوال ایسا نہ تھا جسے وہ نہ سمجھتا اور جان بوجھ کر انجان بنتا۔

''مطلب؟''

''کوئی مشکل سوال نہیں کیا میں نے؟'' اس کی لمبی گردن اکڑی ہوئی تھی۔

''اصل میں یہ ستم رسیدہ عورت ہے۔ٹیمز میں خودکشی کرنے جارہی تھی۔''

''آگے کچھ مت کہنا۔'' عائشہ کی تیز آواز نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔اُس نے طنز سے لبریز نگاہیں اس پر ڈالیں۔

''یہ ستم رسیدہ عورت ہے اور میں کیا ہوں؟ کچھ بتا سکیں گے آپ۔''

نعیم احمد ایک ذہین اور لائق انجینئر تھا۔ذہانت کو پسند کرتا تھا۔اُس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ احمد اتنی ذہین اور تیز طرار لڑکی ہو گی۔اتنی غیر متوقع اور حوصلہ شکن صورت حال سے اس درجہ بہادری سے نپٹے گی۔

''تم میری بیوی ہو۔''

''کونسی؟ پہلی ،دوسری یا تیسری۔'' اس نے پھر وار کیا۔

''شاید چوتھی۔'' اس کا لہجہ بھی نارمل تھا اور انداز بھی۔

''مجھے افسوس ہے میں تمہاری بیوی نہیں بنوں گی۔''

''مگر وہ تو تم ہو ہی۔''

''شاید صرف کاغذ تک۔۔۔۔تمہارے گھر میں اُس وقت تک رہوں گی جب تک کہیں سیٹ نہیں ہو جاتی۔میں اپنی بیوہ ماں کو دُکھ نہیں پہنچانا چاہتی۔''

''تم میری بیوی ہو۔''

اس کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی ہنسی پھیلی ہوئی تھی۔

''اور وہ بیوی نہیں۔''

''نہیں۔''

اس کے چہرے پر پھیلا تناؤ یقیناً عائشہ سے پوشیدہ نہ تھا مگر اس نے پھر بھی چوٹ کرنی ضروری سمجھی۔

''اگر keep ہے تو اور بھی بُری بات ہے۔مذہب نے حرام اور حلال کی راہیں متعین کر دی ہیں۔اصل میں بعض لوگوں کو ممنوعہ چیزیں کھانے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ فطرت سے مجبور ہوتے ہیں نا۔''

وہ شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔یہ اور بات ہے کہ اندر کی روشنیاں اتنی تیز تھیں کہ اسے کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔دیر تک دیکھتی رہی پھر دفعتاً رُخ پھیر کر اُس نے اُسے دیکھا۔

اس کے چہرے پر تناؤ تھا۔نگاہوں میں قہر سا تھا۔اور وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ دھپ دھپ کی تیز آوازیں یقیناً اس کے اندرونی اضطراب کو ظاہر کرتیں اگر فرش پر قالین بچھا ہوا نہ ہوتا۔دمکتی بندیا والی مدھو بغیر ایک لفظ بولے کمبل صوفے پر رکھ گئی تھی۔جسے اس نے اُٹھا کر اپنے اوپر ڈال لیا۔وہیں صوفے پر ٹانگیں پسار لیں اور آنکھیں موند لیں مگر موندھی آنکھوں سے برسات برستی رہی اور رات گھٹتی رہی۔

وہ لوگ کب گئے؟ اسے نہیں علم تھا بس رات تو یوں ہی روتے ہی کٹی تھی۔کہیں پچھلے پہر آنکھ لگ گئی ہوگی۔منہ ہاتھ دھویا،چائے بنائی۔ایک کپ پیا دوسرا بنایا۔خوبصورت پھولوں والے کپ میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔وہ دونوں کندھوں کو کپ پر جھکائے بیٹھی تھی۔بھاپ نے سامنے کی چیزوں کو ایک پل کے لیے دُھندلا دیا تھا۔اس نے کپ اُٹھا کر لبوں سے لگایا اور اپنے آپ سے کہا۔

''ایسی ہی دُھند میرے مستقبل پر بھی چھا گئی ہے جس میں نہ راستے واضح ہیں اور

نہ منزل نظر آرہی ہے۔“

چائے پی کر وہ اُٹھی۔ سارے گھر میں گھومی۔ وہ ایروگرام کی متلاشی تھی۔ شاید کوئی پڑا ہوا مل جائے اور رائیٹنگ ٹیبل کی دراز میں درجنوں لفافے پڑے ہوئے تھے۔ خط لکھنے سے پہلے وہ بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا یخ بستہ تھی۔ لوگوں کا جمِ غفیر رین کوٹ پہنے سڑک پر رواں دواں تھا۔ دائیں ہاتھ بڑی بڑی خوبصورت دُکانوں کے لمبے چوڑے سلسلے نظر آ رہے تھے۔

”میرے لیے اب کون سا راستہ ہے؟“ اس نے گویا اپنے آپ سے سوال کیا۔

”بی بی سی کے اُردو سیکشن میں نعیمہ کا بھائی ہے اس سے ملا جائے۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا کام ہی مل جائے۔“

کھانے والی میز پر ہی بیٹھ کر اس نے اپنی ماں اور بھائی کو مختصر سے خط لکھے۔ خیریت سے پہنچنے، اچھے اور خوبصورت گھر اور نعیم احمد کے اخلاص اور خلوص کے بارے میں لکھ کر اُس نے ایروگرام بند کیے اور بی بی سی جانے اور خط پوسٹ کر دینے کا سوچا۔

اور وہ گھر یونہی کھلا چھوڑ کر اجنبی سڑکوں پر اُتر آئی۔

نعیمہ اُس کی دوست تھی اور مسعود اختر اس کا اکلوتا حقیقی بھائی تھا جو سالوں سے لندن میں رہ رہا تھا۔ اب وہ تذبذب کا شکار تھی کہ اس سے بات کرے یا نہ کرے۔

پر مسعود اختر سے اُس کی ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ وہ چھٹی پر تھا۔ بی بی سی سے وہ واٹر ٹیوب اسٹیشن چلی گئی۔ یوں ہی پریشان سی گھومتی پھری اور جب آٹھ بج گئے اس نے لوٹ جانے کا سوچا۔ تھکے تھکے قدموں سے واپس آئی۔ راہداری میں داخل ہوئی تو معلوم ہوا اندر گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے۔ نعیم احمد کے چلّانے کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ مدھو کی آواز بھی خاصی اونچی تھی۔ وہ سامنے چلی آئی۔ نعیم نے ایک نظر اسے دیکھا اور ترخ کر

بولا۔

''آپ گھر کھلا چھوڑ چلی گئی تھیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں گھر لٹنے کی وارداتیں بہت عام ہیں۔''

''لاک کرنے کا طریقہ بتانا آپ لوگوں کا کام تھا۔''

اب وہ اس کی طرف مڑا اور چیخ کر بولا۔

''اپنا سامان اُٹھاؤ اور ابھی یہ گھر خالی کر دو۔ جنہیں کتوں کی طرح نت نئی ہڈیاں چوسنے کا چسکا پڑا ہوتا ہے وہ کب ایک ہڈی پر قناعت کرتی ہیں؟ آج میں اگر اپنی آنکھوں سے یہ سب نہ دیکھ لیتا تو تم نے تو جھٹلاتے ہی رہنا تھا۔ چلی جاؤ مدھو۔ وہ دھاڑا میرا گھر خالی کر دو۔''

آدھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں گھر مدھو کے وجود سے پاک ہو گیا۔ عائشہ کے لیے یہ ایک اور تعجب خیز امر تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا اور وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ بھوک زوروں پر تھی۔ اس نے کچن میں جا کر دیکھا۔ انڈے اور ڈبل روٹی تھی اُس نے آملیٹ بنایا دو پیس زہر مار کیے اور واپس کمرے میں آ گئی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب وہ اس کے پاس آیا اور بولا۔

''گھر پر تھیں تو کچھ پکا لیتیں۔''

''اوّل تو میں گھر پر نہیں رہی اور اگر رہتی بھی تو مجھے کچھ نہیں پکانا تھا۔ میں کسی کی باندی نہیں۔''

نفرت اُس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

وہ سرخ کمبل اپنے گرد لپیٹے دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے اس میں دھنسی بیٹھی تھی۔ اون گُلکر اُس کے ہاتھ میں تھا جس پر اس کی نگاہیں جمی تھیں۔ اس نے آنکھ اُٹھا کر یہ

دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ نعیم احمد اس کے پاس کھڑا ہے۔تصویروں تک تو تھوڑی بہت دلچسپی رہی پر جب پڑھنے لگی تو یکدم جی اُچاٹ سا ہو گیا۔

''یہ نعیم احمد کیسا انسان ہے؟ کل تک جو جان و جگر تھی۔جس کے ہوتے ہوئے اس نے منکوحہ بیوی کو ایئر پورٹ سے گھر لانے کی زحمت نہ کی۔آج منٹوں میں اسے نکال باہر کیا اور اب اٹوائی کھٹوائی لیے اس کے سوگ میں پڑا ہو گا۔''

اگلی صبح پچھلی صبح جیسی ہی تھی۔پتہ نہیں وہ کب اُٹھا اور کب گھر سے گیا؟ ناشتہ کرنے کے بعد وہ قالین پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ دیر تک سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ باہر دھکے کھانے کی نسبت یہیں بیٹھے۔ماحول سے ذرا واقف ہو تب کوئی قدم اُٹھائے۔

ڈیڑھ بجے تک وہ یہی سوچتی رہی کہ کھانا پکائے یا نہ پکائے۔پھر اس نے صفائی کی، کھانا بھی پکایا اور جب وہ رات گئے گھر آیا اس نے میز پر کھانا بھی لگایا۔جب وہ میز پر آ بیٹھا تو آہستگی سے بولی۔

''مدھو جیسا مجھے نہیں پکانا آتا۔''

''سیکھ کر آتیں۔'' اس نے لقمہ توڑا اور تڑ کی بہ تڑ کی بولا۔

''کیا کرنا تھا سیکھ کر، مجھے کسی کو پکا کر نہیں کھلانے۔''

''عائشہ آئندہ خیال رہے میں اُلٹی سیدھی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

طور طریقے تو ایسی ہی جلی کٹی باتیں سننے والے ہیں۔

قصداً اس نے آواز کو دھیما رکھا تھا اور چُبھتے لہجے میں چوٹ کر گئی تھی۔

اُسکی پیشانی پر غصے سے تین لکیریں نمودار ہوئیں اور پھر وہ پاؤں پٹختا چلا گیا۔وہ اکیلی بیٹھی کھانا کھاتی رہی۔جب وہ کافی پینے لگی، کافی کا مگ ہاتھوں میں تھام کر وہ کمرے

میں آئی اور بولی۔

''سچی باتیں کڑوی ہوتی ہیں۔ برداشت کرنا سیکھو۔'' وہ مگ تپائی پر رکھ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔کافی کی اُسے شدید طلب تھی۔مگ اُٹھا کر اس نے لبوں سے لگایا اور اپنے آپ سے کہا۔

''یہ دھان پان سی پانچ فٹی لڑکی کیا توپ شے ہے؟''

رات کو اسے تفکرات کے باوجود نیند آ گئی شاید تھکی ہوئی تھی۔صبح جلدی اُٹھ بیٹھی۔ دودھ کی بوتلیں اُٹھا کر لائی۔ناشتہ تیار کیا۔میز پر رکھا تو وہ بھی آ گیا۔دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔جب وہ کار کی چابی ہاتھ میں پکڑ کر آفس جانے کے لیے باہر نکلنے لگا تو دفعتاً مُڑا۔جیب سے پونڈ کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''گھر کا سودا ختم ہو رہا ہو گا۔یہاں سے دائیں طرف سپر سٹور ہے۔جس جس چیز کی ضرورت ہو لے آنا۔''

اس نے نوٹوں کی گڈی ہاتھ میں اُٹھائی۔دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اُسے پھڑ پھڑا کر تعداد کے بارے میں سرسری سا اندازہ لگایا۔تب نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

''اتنی رقم دے دی ہے اگر میں لے کر بھاگ جاؤں تو۔''

''تم بھاگنا چاہتی ہو۔'' اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔اسے کھولا۔ سگریٹ سلگایا۔لمبا کش لیا اور اُس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

وہ اُس کے عین سامنے کھڑا تھا۔تنا ہوا چہرہ دھواں اُڑا رہا تھا اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ایک پل کے لیے وہ لرز سی گئی مگر دوسرے لمحے بڑی ہمت سے مضبوط آواز میں بولی۔

''بالکل چاہتی ہوں ۔مگر سر پر چھت نہیں اور جیب میں پیسہ نہیں اور اس اجنبی ملک میں، مَیں کوئی رسک لینا نہیں چاہتی ۔''

''اچھا خدا حافظ ۔'' کہتے ہوئے وہ مڑا اور باہر نکل گیا ۔وہ دیر تک کھڑی سوچتی رہی ۔اپنے آپ سے اُلجھتی رہی ۔

ڈیڑھ بجے مارکیٹ گئی ۔ایسی خوبصورت اور شاندار دُکانیں کہ جنہیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جائے ۔دو گھنٹے تک گھومتی پھرتی رہی ۔پھر ہوش میں آئی ۔موٹی موٹی خریداری کی اور گھر لوٹی ۔کھانا تیار کیا ۔ٹی وی کھولا ۔مار دھاڑ والی فلم چل رہی تھی ۔بور ہوئی مگر بیٹھی دیکھتی رہی اور کرتی بھی کیا ۔وقت تو کاٹنا تھا ۔سات بجے، آٹھ بجے پھر نو بجے، دس بجنے کی بھی ٹک ٹک ہوئی اور جب آئینہ نما کلاک پر گیارہ کے ہندسے نمودار ہو گئے تب وہ پریشان ہو اُٹھی ۔

''کیوں نہیں آیا وہ ابھی تک ؟ کہاں جائے ؟ کس سے پوچھے؟ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو؟'' اور وہ جی جان سے لرز گئی ۔

''میرے اللہ رحم کر ۔مصائب کے بھنور میں پھنس گئی ہوں ۔مجھے اس سے نکال ۔''

ساری رات بس اونگھتے جاگتے کٹی ۔صبح کے قریب آنکھ لگی تو کہیں گیارہ بجے اُٹھی ۔اُٹھنے کے بعد پہلی سوچ یہی تھی کہ اب کیا کرے؟

''میں نے کیا کرنا ہے؟'' وہ اپنے آپ سے بولی ۔

''آرام سے بیٹھتی ہوں ۔اب میں کہاں اسے ڈھونڈتی پھروں؟ عجیب تماشا ہے یہ آدمی بھی ۔ایک سے ایک نیا چکر، غائب ہو گیا ہے تو ہو جائے ۔میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں ۔''

وہ غصے سے کھولتی سارے گھر میں ہنہناتی پھری ۔اپنے آپ سے باتیں کرتی

رہی۔

''کوئی بات ہے بھلا۔عورت گھر میں ڈالی ہوئی تھی تو نکاح کیوں کروایا۔پھر ویزا بھیجا۔اور جب معاملہ گلے پڑنے والا ہوگیا تو درمیان سے سرک گیا۔ساری اُمنگیں اور خواب چکنا چور ہو گئے۔آنے کی اطلاع دی تو گھر اس کے پہلو میں بیٹھا رہا اور اگلے دن اُسے نکال باہر کیا اور اب خود غائب ہوگیا بے غیرت کہیں کا۔''

''بھاڑ میں جائے۔مائی فٹ''

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ سب اپنے آپ سے کہتی رہی۔مگر اتنے بڑے گھر میں اُس کا جی ہول کھاتا رہا اور وہ خوف سے پیلی پڑتی رہی۔

اس شام اس نے فوراً بتیاں بُجھا دیں اور بڑے کمرے میں بستر پر دبکی پڑی رہی۔دس بجے وہ پھر اُٹھی۔ساری بتیاں پھر جلائیں اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔لمبے لمبے سجدوں میں کتنا وقت لگایا۔دو دن کی ساری قضا نمازیں پڑھیں مگر اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی جب اُس نے وقت دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے رات ٹھہر گئی ہے اور وقت کے پاؤں میں کسی نے زنجیریں پہنادی ہیں۔

اگلی صبح اس نے ناشتہ کیا۔کپڑے بدلے۔تھوڑے سے پیسے جیب میں ڈالے اور گھر لاک کر کے نکل کھڑی ہوئی سارا دن وہ آکسفورڈ سٹریٹ میں گھومتی رہی۔دنیا دیکھتی رہی۔نئے نویلے ایشیائی جوڑے خریداری کے لیے آتے،ان کے مقدر پر رشک کرتی رہی۔کیمسٹ کی ایک دوکان سے اُس نے کوک اور نمکین بسکٹ کھائے اور ساڑھے دس بجے کے قریب گھر واپس آگئی عشاء کی نماز پڑھی اور سوگئی۔

اب اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ناشتے سے فارغ ہوکر باہر نکلتی۔لندن کا نقشہ اس کے پاس تھا۔اس کی اور پولیس مین کی مدد سے وہ اپنے راستے کا تعین کرتی۔یوں دن

گزار کر رات کو گھر آ جاتی۔ مسعود اختر سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس کے ہر ممکن تعاون کے وعدے نے اُسے بہت دلا سا دیا تھا۔

مستقبل کیا ہوگا؟ حالات کا یہ رخ بہا کر اسے کہاں لے جائے گا؟ یہ سب اُس نے اوپر والے پر چھوڑ دیا تھا۔ جو کچھ مقدر میں ہوگا بھگتوں گی۔ اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی دو تین دن پہلے سونے والے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اُسے نعیم احمد کے وزیٹنگ کارڈ بھی مل گئے، جن پر اُس کا آفس کا ایڈریس اور فون نمبر درج تھا مگر اُس نے فون کرنے کی کوشش کی نہ دفتر جانے کی۔

اتوار کا دن تھا وہ ہائیڈ پارک میں جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھی صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں ایک سے ایک سر پھرا موجود ہے اور اپنے دل کا غبار نکال رہا ہے۔ میں بھی سر پھری ہوں یہاں پر کھڑی ہو کر سب کچھ اُگل دوں جو اتنے دنوں سے میں اکیلی اپنی جان پر اُٹھائے ہوئے ہوں۔

ابھی وہ اُگلنے اور نہ اُگلنے کے بارے میں حتمی فیصلہ پر اُلجھی ہوئی تھی جب اسے نعیم احمد نظر آیا۔ عجیب سی بات تھی کہ اُسے دیکھ کر نہ تو اُس کا دل دھڑکا اور نہ ہی وہ گھبرائی۔ وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ بیٹھی رہی۔ قریب آ گیا تو بے اختیار وہ جیسے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہیلو! ٹھیک تو ہیں آپ؟'' وہ مسکرایا۔

''آپ کو کیسی نظر آ رہی ہوں؟'' وہ بہت سنجیدہ تھی۔

''خاصی ہشاش بشاش۔''

''گھر سے غائب کیوں ہو گئے ہیں؟''

''بھئی آپ بھاگنا چاہتی تھیں۔ چھت اور روپیہ راہ میں حائل تھا۔ میں نے سوچا یہ سب آپ کو دے کر خود بھاگ جاؤں۔ بات تو ایک ہی ہے۔ اچھا بتایئے چائے پئیں گی؟''

''مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' اسے انکار کرنا اچھا نہ لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ریستوران میں آ گئے۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ بولا۔

''اکیلے ڈر تو نہیں لگا؟''

''بالکل نہیں۔'' اُس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

''دن رات کے بیس گھنٹے میں اپنے دل کو صرف یہ سمجھانے پر صرف کرتی رہی ہوں کہ میرا واسطہ ایک عجیب الخلقت انسان سے پڑا ہے۔ اس لیے ذرا ذرا سی بات پر گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''تو میرے بارے میں یہ ریڈنگ ہے تمہاری۔''

چائے لوازمات کے ساتھ میز پر آ گئی تھی۔ اس نے چکن پیس اُٹھا کر کھانا شروع کیا اور کچھ دیر بعد بولی۔

''جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے وہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

چائے کے کپ سے اُٹھتی بھاپ پر چند لمحے اُس کی نظریں جمی رہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتی ہر احساس سے بے نیاز وہ دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے اس کی مدھم سی آواز نے اُسے متوجہ کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہاری صاف گوئی، ذہانت اور جرات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ تمہاری تصویر دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ ہو گی کوئی کمزور سی، دبو قسم کی، بات بات پر رو دینے والی لڑکی۔''

وہ بایاں رخسار بائیں ہاتھ کے ہالے میں لیے بیٹھی آنکھیں اس پر جمائے سُن رہی تھی۔ دبو قسم کی لڑکی پر چپ نہ رہ سکی۔ فوراً بول اٹھی۔

''شاید اسی لیے تم نے مجھے رُلانے اور بھگانے کے سامان کر رکھے تھے۔
''یقیناً نہیں۔'' اُس نے اپنے لیے دوسرا کپ بناتے ہوئے اطمینان وسکون سے کہا۔

مغربی ممالک میں رہتے ہوئے اگر کوئی اپنی پارسائی کا دعویٰ کرے تو یہ غلط ہے، ویسے لاکھوں میں شاید کوئی ایک آدھ کیس ہو بھی۔ وگرنہ یہاں عورت کے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ میری پہلی دوستی ریٹا سے ہوئی۔ وہ تقریباً تین سال میرے ساتھ رہی۔ میں نے اس سے شادی کی مگر یہ شادی ناکام ہوئی۔ وجہ بس ذہنی تضاد تھا۔ اصل میں میری ایک عجیب سی عادت ہے کہ وفا کے سلسلے میں جو توقعات میں دوسروں سے رکھتا ہوں، خود بھی اُن پر پورا اُترتا ہوں۔ ریٹا جب تک میرے ساتھ رہی، میرے ذہن میں کبھی کسی دوسری عورت کا خیال نہیں آیا۔ میں مکمل طور پر اُس کا تھا۔ جب اُس نے طلاق لے لی مہینوں میں پریشان رہا۔ پھر مدھو کی دوست اور ہم مذہب بملا سے میرے تعلقات پیدا ہوئے۔ اُس نے میرے ساتھ شادی نہیں کی مگر ہم اکٹھے رہتے رہے۔ مدھو کو جی۔ ایس شرما نے ڈاج دیا وہ خودکشی کرنے ٹیمز جارہی تھی جب میں اور بملا اُسے سمجھا بجھا کر گھر لے آئے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ بملا میرے گھر سے کیوں غائب ہوگئی؟ میں نے اُسے بہت تلاش کیا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ مدھو بملا کے بعد بھی میرے ہاں رہتی رہی۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اطمینان تھا کہ وہ میرے گھر کی بہترین طریقے سے دیکھ بھال کرتی ہے۔ مجھے وقت پر تیار کھانا ملتا اور میری دیگر ضروریات بھی پوری ہوتی تھیں۔ ایک دن میں نے مدھو کو چند قابل اعتراض لوگوں کے ساتھ دیکھا۔ میں نے اُسے منع کیا مگر تمہارے آنے سے اگلے دن میں نے اسے پھر انہی لوگوں کے ساتھ دیکھا۔ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی۔ اسی لیے میں نے اُسے گھر سے نکال دیا۔

اب تم یہ کہو گی کہ میں تمہیں لینے ائیر پورٹ نہیں آیا۔ میں نے تمہیں ٹکٹ نہیں بھجوایا۔ اصل میں، مَیں تمہیں ابھی بُلانا نہیں چاہتا تھا۔ مدھو سے گھر خالی کروا کے تمہیں بلانے کا پروگرام تھا۔

دونوں اب چُپ تھے۔ چائے بھی ختم ہو گئی تھی۔

پھر دفعتاً اپنے شانوں کو آگے کی جانب سکیڑتا ہوا وہ اس کی طرف جُھکا اور مدھم سے لہجے میں بولا۔

''تم میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔''

اُس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ اس لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ پل بھر کے لیے وہ سناٹے میں آ گیا۔ اُسے کچھ یوں لگا تھا جیسے ''ہرگز نہیں'' ایک ہنٹر کی طرح اُس کی پشت پر پڑا ہو اور اُس کا گوشت اُڑا لے گیا ہو۔ ناقابل برداشت درد اور شکست کا احساس۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا اور آواز میں وہ تیزی، شوخی اور اعتماد اُڑنچھو ہو گئے تھے جو ابھی چند لمحے پہلے اس کی گفتگو میں نمایاں تھے۔

دیر بعد وہ بولا۔

''شاید میرا Used ہونا تمہارے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔''

اُسے اپنی آواز کی شکستگی اور اس کا کھوکھلا پن خود محسوس ہوا تھا۔

''نہیں تو۔''

اس کی آواز اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے نیازی افسردہ سی رکھائی اور قطعیت کا احساس تھا۔ چند لمحے وہ چپ چاپ اپنے سامنے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی نظریں خالی خالی ہوں اور وہ کوئی بھی منظر جذب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہو۔

بولی تو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

''Usedچیزیں تو ہمارے مقدر میں ازل سے لکھی ہوئی ہیں۔بہن بھائیوں کی اُترن ہی سدا پہنی اور پہنائی گئی یوں کہ اچھے اچھوں کو کبھی شک نہ گزرا۔''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

اور اس پھر نے جیسے روئی کے ڈھیر میں تیلی لگا دی تھی۔آگ یوں بھڑکی کہ بے شک بھانبڑ تو نہ مچا پر آگ کے کسی قدر تیزی سے سلگنے اور آگے بڑھنے والی بات ہو گئی تھی۔

''نعیم احمد ببر شیر جیسے حوصلے والی عورت کا دودھ رگِ جان بنا ہوا ہے۔جی داری اور اعلیٰ ظرفی جیسی روایات سے دوستی کا چلن جزو دستورزندگی رہا۔ایسے میں کسی بزدل اور کمزور مرد کے ساتھ زندگی گزارنا تو ہر لمحے اپنے وجود کے ٹوٹے کرنے ہیں۔

پرس کھل چکا تھا۔چابی ہاتھوں میں تھی۔میز پر دھیمے سے اُسے رکھتے ہوئے اُس نے باہر آتے ہوئے پلٹ کر کچھ نہیں دیکھا تھا۔

پرکھ کی کسوٹی

اس نے نذر ل کی ''گنی بیٹا'' میاں کے خاص شیلف میں رکھی اور باہر آنگن میں آ گئی۔ پیاری پُھوا غربی دالان میں تخت پر نماز کے لیے کھڑی تھیں۔نیت کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ اُسے کُھلے بالوں کے ساتھ امرود کے درخت کے پاس کھڑے دیکھ کر غصے سے بولیں۔

''مجال ہے جو اس لڑکی کو کہے کا کچھ اثر ہو۔لاکھ سر پٹخو کہ دونوں وقت ملتے ہوں تو ننگے سر پیڑوں کے پاس کھڑے نہیں ہوتے پر یہ ہیں کہ ضرور کھڑی ہوں گی۔''

اس نے کوفت اور قدرے بیزاری سے ان کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں خود سے بُڑبُڑائی۔

''میں بھی بڑی قتالہ عالم ہوں کہ جنوں اور دیووں کو عاشق ہونے کے لیے مجھ سے اچھی کوئی ملے گی ہی نہیں۔''

وہ کمرے میں چلی آئی۔رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر اُس نے کچھ سوچا۔مزمّل کا خط دنوں سے آیا پڑا تھا۔جواب ہی نہ دے سکی۔ٹیبل لیمپ جلا کر اس نے کوثر کو آواز دی۔

''اے بی! خدا تمہیں خوش رکھے جو تم مجھے ایک کپ چائے کا دے جاؤ۔میں نے

شام سے نہیں پی۔"

چائے سے اُٹھتی بھاپ کو اُس نے بغور دیکھا۔سر جھکایا، روشنی میں نہائی، پیڑ پر جُھکی اور جُھکتی چلی گئی۔

"مزمّل تم نے شائستہ کے بارے میں پوچھا ہے؟" ڈھیر سارا لکھ چکنے کے بعد جب اس نے یہ جُملہ لکھا تو قلم رکھ دیا۔لمبی سانس بھر کر اپنے سامنے دیکھا۔چائے کا کپ اُٹھایا چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی پر اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے پی ڈالی۔

"تمہیں یقیناً یاد ہوگا جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ٹیبل ٹینس کی میز پر بیٹھ کر ہم ان لڑکیوں پر کومنٹس کرتے تھے جنہیں لینے کے لیے ڈھاکہ کے امیر زادوں کی گاڑیاں سرِ شام ہی گیٹ کے گردمنڈلانی شروع ہو جاتی تھیں۔تمہیں دُکھ ہوگا اگر میں کہوں کہ ہماری وہ سیدھی سادی سی شائستہ بھی ویسی ہی بن گئی ہے۔

ہاں تو کہو کب تک آؤ گی؟ سبھی تمہیں مس کر رہے ہیں۔تمہیں یقین دہانی کی ضرورت تو نہیں پر احتیاط کے طور پر میں ایک بار پھر لکھے دیتی ہوں کہ میرے لیے اس بار ڈھیر سارے سفید شہتوت ضرور لانا۔

"اے باؤلی ہوگئی ہو۔شادی نہیں کرو گی تو کیا کنوار کوٹھا چھتو گی؟ عفت عثمان نے چھوٹے بچے کے دُھلے ہوئے پوتڑوں اور پاجاموں کو تار پر تیزی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔

تین دن ہو گئے تھے رم جھم کا سلسلہ شروع ہوئے۔کبھی دیوانی تھی وہ اس موسم کی۔بادل آتے چاہے کڑکڑاتی سردیوں ہی کے ہوں مارے خوشی کے اس کا پاؤں زمین پر نہ ٹکتا۔ایک ایک سے کہتی،

"اے موسم تو دیکھو کیا غضب ڈھا رہا ہے۔پر جب سے ماں بنی تھی موسم کا سارا

حُسن اور خوبصورتی بچے کے منٹ منٹ کے پیشاب اور پاخانوں نے نگل ڈالی تھی۔ آج صبح دھوپ نکلی اور شکر شکر کرتی وہ غسل خانے میں گھسی۔ شائستہ وہیں اس کے پاس ہی آ کر دہلیز پر بیٹھ گئی تھی۔ آنکھیں کچھ متورم تھیں۔ ناک کی پھُننگی سرخ ہو رہی تھی۔

''جی کیسا ہے؟'' عفت نے بغور اسے دیکھا کپڑوں سے بھری پرات اُٹھائی اور اُٹھتے ہوئے بولی۔

''آؤ برآمدے میں چلیں۔ میں انہیں پھیلا دوں۔''

کُرسی پر بیٹھ کر اس نے منڈیر سے نیچے آتی دھوپ کو بڑی افسردگی سے دیکھا اور شکست خوردہ آواز میں بولی۔

''اماں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ذہنی طور پر میں کسی دوسرے مرد سے نباہ کے قابل نہیں رہی۔ زبیر نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ یوں بھی دیکھو نا عفت پانچ چھ ہزار کا ملازم۔ گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا والی بات ہی ہو گی نا!''

کوثر اندر رلائی میں لیٹی پڑی تھی۔ شائستہ کی برآمدے میں آواز سُنی۔ جی تو چاہا اُٹھ کر اس کی باتیں سُنے پر ابھی رات ہی حیدر آباد سے لوٹی تھی۔ لمبے سفر نے ہڈّی ہڈّی چٹخا ڈالی تھی۔ کمرے میں چوکیوں پر منجھلے اور بڑے بھیا ناشتے میں مصروف تھے۔ اس لیے اس کے اندر بلانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ عفت دیر بعد جب اسے رخصت کر کے آئی تو اس نے پوچھا۔

''یہ آج صبح ہی آدھمکیں۔ خیریت تھی۔ کیا بن رہا ہے اس کی شادی وادی کا؟''

''اے ہاں تمہیں تو شاید معلوم نہیں زبیر ملائشیا چلا گیا ہے۔ بتاتی ہے کچھ اس کے کاروباری معاملات تھے۔ گھر میں ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ لڑکا کسی بینک میں چھ ہزار پر ملازم ہے پر یہ رضامند نہیں۔ ایک تو بقول اس کے لڑکے کا کوئی اسٹیٹس نہیں۔ تنخواہ کم ہے۔ یوں

بھی اسے یقین ہے کہ زبیر واپس آ کر اسے ضرور اپنائے گا۔''

''کروک پھولک لک بن گئی ہے اور ٹنگارا ابھی بھی آسمان پر ہے۔لو چھ ہزار کمانے والا اس کے دھیان ہی میں نہیں۔زبیر واپس آ چکا۔''

''اے بی اب اُٹھ چکو۔دُلہن تمہاری خاطر برتن سمیٹنے سے بیٹھی ہے۔'' پیاری پھوادالان سے بولیں۔

شائستہ کھری کشمیرن تھی۔سفید رنگت پر خون ٹپکاتے رخسار، نقش موٹے موٹے تھے۔چہرہ قدرے چوڑا۔بہت حسین نہیں تھی پر اس کے ہاتھ پاؤں اتنے ہی خوبصورت تھے جتنا کہ جھوٹ بول لیا جائے۔گھنٹوں دیکھو اور جی نہ بھرے والی بات تھی۔کمبخت ان پر محنت بھی بہت کرتی۔کپڑوں سے میل کھاتی کیوٹکس اور قیمتی رنگ برنگی انگوٹھیاں ان کے حُسن کو اور بھی دوبالا کر دیتیں۔

اس کا باپ ریلوے میں معمولی ملازم تھا۔ماں بڑی سیدھی اور ربڑ بولی قسم کی تھی۔دو بچوں کو ہی جنا تھا کہ سوکن پڑ گئی۔میاں کے کسی دوست کی بہن تھی۔بیمار ہو کر گاؤں سے شہر علاج کے لیے آئی۔کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔دوست نے اپنے گھر کی پیشکش کر دی۔آئی تو تھی آگ لینے اور گھر والی بن بیٹھی۔شائستہ کی ماں اوندھی کو پتہ ہی نہ چلا۔کھیل بگڑ گیا تو روئی پیٹی۔آس پڑوس اور محلے والیوں نے کہا۔

''بوا تم تو افیون کھائے بیٹھی تھیں۔اشارے کنایوں میں بہتیرا کہا۔اب کیا ڈھول پیٹتے کہ بی گھر سنبھالو آگ لگ رہی ہے۔پر تمہیں تو میاں پر اعتماد تھا۔کون اُلجھتا تم سے۔لو دیکھ لو۔''

محدود آمدنی اس پر دونوں بیویوں نے جو بچے پیدا کرنے شروع کیے تو ڈھیر لگ گئے۔شائستہ کا بچپن عفت، کوثر اور مزمّل کے ساتھ گزرا تھا۔گھر ایک ہی گلی میں تھے۔غریبی

کی وجہ سے وہ سارا دن ان کے گھر ہی میں گھسی رہتی۔اس کی ماں بہنوں کو تو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس کی طرف توجہ دیتیں ۔پڑھائی لکھائی میں بھی نکمی ہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ شائستہ کی بڑی بہن کی شادی ہوئی ۔لڑکا جہلم کی طرف کے کسی اچھے کھاتے پیتے زمیندار گھر کا تھا۔شہر میں اس کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا۔یوں بھی حسین اور دل کا کھلا تھا۔وہ گھرانہ جو پیاز کے گٹھے کی طرح تہہ در تہہ غریبی میں اُلجھا ہوا تھا،اس کے چند پرت یوں سرک گئے کہ محلے والیوں نے رشک اور حسد دونوں جذبوں سے مجبور ہو کر بے اختیار سوچا۔

''اے نا جو کو داماد تو ہیرا ملا ہے۔''

شائستہ جب پہلی بار بہن بہنوئی کے ہاں ہفتہ بھر رہ کر آئی تو اس نے واپس آ کر تینوں بہنوں کو ایسی باتیں سنائیں کہ وہ بس حیرت سے اسے دیکھتی رہیں۔

اور جب دوسرے نمبر والی بہن کی شادی ہوئی تو بس جانو جیسے بہار آ گئی ۔اس کا شوہر اوورسئیر تھا اور ھذا مِن فضلِ ربی ؐ کے اصول پر پوری سرگرمی سے عمل کرتا تھا۔ بڑی بیٹی نے ڈھویا ڈھوئی میں جو کسر چھوڑی وہ چھوٹی والی نے پوری کر دی اور شائستہ کی ماں کہ سدا کی منہ پھٹ ۔ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں پہن کر ایک ایک سے کہتی پھرتی ۔

''اے میری چھینو (نسرین) نے بنا کر دی ہیں ۔کپڑوں کی طرف اشارہ کرتی ۔ پیسے نو خرید کر لائی تھی ۔اسے ڈیزائن پسند نہیں آیا۔مجھے کہنے لگی ''اماں تم بنوا لو۔کل آئی تھی ہزار روپیہ خرچے کے لیے دے گئی ہے۔''

کسی بات کا پردہ رکھنا اُسے آتا ہی نہیں تھا۔بعد میں میل جول والیاں ٹھٹول بازی کرتیں۔

یہ تینوں بہنوں کو ہی معلوم تھا کہ شائستہ اپنے پھوپھی زاد سے کچھ وابستگی رکھتی

ہے۔ دُبلا پتلا خوبصورت لڑکا جی جان سے اس سے شادی کے لیے تیار تھا۔ پر اس دن جب عفت فرش پر پھسکڑا مارے اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھی اور مزمّل Identical twins کی خصوصیات پڑھنے میں محو تھی وہ آئی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مزمّل نے کتاب پر سے نظریں اُٹھائیں۔ سیون ہیون کی خوشبو کو زور سے سونگھا۔ مہین قیمتی کُرتے کے کاجوں میں ہلکورے کھاتے چاندی کے بٹنوں کی بناوٹ کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''اسد کا کیا حال ہے؟''

''مجھے تو پتہ نہیں۔'' اس کے انداز میں لاپروائی کے ساتھ ساتھ قدرے رکھائی بھی تھی۔ مزمّل کو تو جانو جیسے سانپ سونگھ گیا جب اس نے کہا۔

''میں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ پنی باجی کا خیال ہے کہ اس کی پانچ چھ ہزار تنخواہ میں میرا گزارہ کہاں ہوگا؟ وہ اصل میں اپنے رشتے کے دیور افضل سے میری شادی چاہتی ہیں۔ سچ مزمّل، افضل کا خاندان بہت امیر ہے۔ ہم مری گئے تھے تو اس نے بہت خرچ کیا۔''

عفت نے قلم روک کر اسے بڑے دھیان سے دیکھا اور تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''تم دولت پر ریجھ گئیں۔ پچھتاؤ گی۔''

''ارے چھوڑو جس کے پاس پیسہ نہیں اس کی بھی کوئی زندگی ہے۔''

دونوں بہنیں اس سے کافی اُلجھیں۔ پھر لگتا تھا کہ بہن کی ہر وقت کی سکھا پڑھی اور افضل کی دولت نے اس پر مسمریزم کر دیا ہے۔

اس کے بعد اس کا عفت کے ہاں آنا بھی بہت کم ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں رہتی ہی نہیں تھی۔ بہن کے ہاں ہی گھسی رہتی۔ پر جب کبھی آتی۔ افضل کے قصیدے ان لوگوں کے

پاس بیٹھ کر ضرور پڑھتی ۔الف سے یے تک ساری کہانی سناتی ۔اس کے جانے کے بعد تینوں بہنیں سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں اور اس کی گفتگو کے ایک ایک ٹکڑے کا تجزیہ کرتیں۔وہ تجزیہ کچھ اس قسم کا ہوتا۔

دونوں بہنیں اسے پھانسنے کی سخت تگ و دو میں مصروف ہیں۔بہنوئی چچیرے بھائی کی شادی اپنی بہن سے چاہتا ہے اور افضل لاہور میں وقت کٹی کر رہا ہے وہ قطعاً سنجیدہ نہیں۔

گرمیوں اور سردیوں کے سلسلے جاری رہے۔کئی بہاریں آئیں اور خزائیں گزریں۔مزمّل بیاہ کر کوئٹے چلی گئی ۔عفت اور کوثر کی چھوٹے ابا کے بیٹوں سے گھر ہی میں شادیاں ہو گئیں۔

اور اس برستی شام میں جب عفت دالان میں بیٹھی یونہی اُداس سی ہو رہی تھی۔بارش میں بھیگتی وہ آئی ۔دیر بعد اسے دیکھ کر عفت نے خوشی سے کہا۔

''شائستہ تم ہمیں بھول گئی ہو۔''

''میں تو اپنے آپ کو بھولتی جا رہی ہوں ۔''

اس کے سینے سے ایک دُکھ بھری لمبی آہ نے عفت کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

''عفتی!''

وہ بڑی بے جان آواز میں بولی۔

''تمہیں تو شاید پتہ نہیں افضل کی شادی ہو گئی ہے ۔میرا بہنوئی بہت ذلیل نکلا۔اپنی بہن کو وہاں گھسیڑنے کے لیے اس نے بہت کمینگی کا ثبوت دیا۔افضل بھی بہت فضول انسان ثابت ہوا۔میرا جی چاہتا ہے میں کسی بڑے امیر آدمی سے شادی کروں ۔افضل کو پتہ چلے کہ وہی دنیا میں ایک نواب نہیں تھا جس پر میں لٹو تھی۔''

اورعفت نے دُکھ اور ہمدردی سے اپنی بچپن کی اس سہیلی کو دیکھا جسے غلط ماحول نے تباہ کرڈالا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد مزمّل نے ٹانگائل کی آبی رنگی نفیس کڑھت کی ابرق لگی ساڑھی کو خاص گھریلو بنگالی خاتون کے انداز میں باندھا۔بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا کر اسے شانوں پر چھوڑا۔موسم کھلا ہوا تھا۔ننگے پاؤں چلتی جب وہ برآمدے میں آئی اس کی آنکھوں میں نمی اُتری ہوئی تھی۔یہ ساڑھی گزشتہ دنوں میجر عبداللہ نیّ کی بیگم نے سری لنکا سے آنے والے ایک نیپالی جوڑے کے ہاتھ اسے بھیجی تھی۔ڈھاکہ کی تو ایک ساڑھی بھی اب اس کے پاس نہیں بچی تھی سب پھٹ پھٹا گئی تھیں۔

بیٹ مین تازہ ڈاک برآمدے میں بچھی میز پر رکھ چکا تھا۔اس نے اپنے اور میاں کے خطوں کی چھانٹی کی اور ایزی چیئر میں دھنس کر لاہور سے آیا ہوا خط کھول لیا۔

''تم نے بہت بار پوچھا اور میں نے ہر بار اس ذکر سے گریز کیا، پر اب میں سمجھتی ہوں مجھے سبھی کچھ لکھ دینا چاہیے۔ اس دن دھوپ بہت خوشگوار تھی میں نے Frister Ressmon نکال کر آنگن میں رکھی۔چھوٹے چچا کو ڈھیر ساری دعائیں دیں جنہوں نے میری صد ہزار التجاؤں کے بعد بالآخر یہ مشین مجھے بھیج ہی دی۔ Booklet پڑھتے میں اور کوثر آپس میں جھگڑ رہی تھیں، جب شائستہ ہمارے ہاں آئی۔تم سوچ بھی نہیں سکو گی مزمّل وہ برقعہ پہنے ہوئے تھی۔اپنے پُرانے معمول کے مطابق وہ فرش پر ٹانگیں پسار کر بیٹھی۔کوثر نے موڑھا بڑھایا جسے اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا۔

''اے ہٹاؤ اسے۔تکلف برتنا شروع کردیا ہے میرے ساتھ۔''

اس کے شانوں پر ہلکورے کھانے والے بال ایک چھوٹی سی چوٹی میں گُندھے ہوئے تھے۔وہ قیمتی کپڑے ضرور پہنے ہوئے تھی پر گلا تنگ اور آستین لمبی تھی۔ناخن چھوٹے

اور بغیر کیوٹکس کے تھے۔چہرے پر افضل کے حادثے کے بعد والی ویرانی ختم تھی۔ہم نے ان تبدیلیوں کو ظاہر ہے حیرت سے دیکھا۔وہ سمجھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے زبیر جیسا انسان ملا۔امیر پڑھا لکھا، نیک، خدا ترس۔''

تم تو جانتی ہو رائی کے پہاڑ بنانا اس کی پُرانی عادت ہے۔

''تم غلط راستے پر چل نکلی ہو شائستہ۔کوٹھیوں اور کاروں والوں سے ناطہ جوڑنا چاہتی ہو۔اسٹیٹس اور بینک بیلنس کے چکروں میں اُلجھ گئی ہو۔یاد رکھنا خطا کھاؤ گی۔''

کوثر سے بھلا کہاں ضبط ہوتا۔دُکھ تو مجھے بھی ہوا تھا آخر یہ لڑکی دولت کی کن گھمن گھیریوں میں پھنس گئی ہے کہ اسے اچھے بُرے کی تمیز ہی نہیں رہی۔بھلا یوں بھی کبھی شادیاں ہوئی ہیں۔مرد لوگ فلرٹ کرتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں۔یہ کیوں نہیں سمجھتی؟ اپنے طور پر ہم نے اسے سمجھانے کی سعی کی اور ہوا یوں کہ وہ ہم سے روٹھ کر چلی گئی۔

مہینے گزر گئے۔ایک دن مجھے یونہی اس کی ہڑک اُٹھی کہ اس کا پتہ تو کروں۔اس کے گھر گئی معلوم ہوا وہ کسی فیکٹری میں ملازم ہوگئی ہے۔شام کو آتی ہے۔اس کی چھوٹی بہن نے یہ معلومات دیں۔انجانے اندیشوں سے میرا دل گھبرا اُٹھا۔شام کو وہ گھر آئی۔بہن نے میرے بارے میں بتایا تو انہی قدموں پر وہ ہمارے ہاں چلی آئی۔

''کہاں کام کرتی ہو تم؟'' میرے استفسار پر اس نے کوئی بات چھپانی مناسب نہیں سمجھی۔صاف صاف بتا دیا۔بارہ بجے تک ایک فیکٹری میں کام کرنے کے بعد وہ زبیر کے ساتھ چلی جاتی ہے۔چار گھنٹے اس کی معیت میں گزار کر شام کو گھر آجاتی ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے زبیر کو افضل والی ساری بات بتا دی ہے۔

''اُلّو!'' کوثر دھاڑی۔

''کیا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔پیٹ پھول رہا ہوگا۔''

''اے کیا جھوٹ بولتی۔اس نے پوچھا میں نے بتا دیا۔''

''پر یہ زبیر تمہیں کیسے ملا؟''

''عزاداری کی ایک مجلس میں سوز خوانی کے لیے گئی تھی۔واپسی پر کوئی سواری نہیں ملی۔یہ اپنی گاڑی میں گزر رہا تھا۔اس نے لفٹ دے دی۔بس یوں تعلق بڑھ گیا۔''

اس نے ایک بار چاہا بھی کہ میں یا کوثر اس کے ساتھ چلیں اور زبیر سے ملیں۔میرا تو کچھ ارادہ بھی تھا پر کوثر نے ڈرا دیا۔

''عثمان تمہارا سر توڑ دے گا یاد رکھنا۔'' اور میں سہم کر چپکی ہو رہی۔پر مزمّل ایک دن جب میں مُنّے کے لیے کپڑے خریدنے بازار گئی تو اتفاق سے میری ان سے مُڈبھیڑ ہو گئی۔اب چھٹکارا کہاں تھا؟ میں نے بھی پلّہ چھڑانے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔سوچا دیکھوں تو سہی کیسا ہے؟ اس کے بارے میں کتنا سنجیدہ ہے؟

تین گھنٹے جب اس کی گاڑی میں گزار کر میں واپس آئی تو مجھے دُکھ ہوا۔اُس نے شادی کے بارے میں کسی خیال کا اظہار نہیں کیا۔اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ اپنے خاندانی مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔بڑا بھائی بے اولاد ہے اور اس نے زبیر کو پالا ہے۔وہ اس کی شادی اپنی سالی سے چاہتا ہے۔یہ رضا مند نہیں۔گفتگو سے وہ ذہین اور پڑھا لکھا لگتا تھا۔صاف گو قسم کا آدمی تھا۔اس نے یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھی کہ اس کا خاندان بہت غریب تھا۔ہمت،محنت اور کوشش سے اب اونچی جگہ پر کھڑا ہے۔صاف گوئی سے کام لوں تو یقیناً یہی کہہ سکوں گی کہ میں نے اُسے پسند کیا تھا۔پر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ شائستہ سے شادی ہرگز نہیں کرے گا۔اس جیسے لڑکے کے لیے ہزاروں لڑکیاں۔

یہی سب باتیں گھر آ کر میں نے کوثر سے کہہ دیں۔اس گدھی کوثر کی عقل دیکھو

اگلے دن جب وہ آئی تو من وعن اسے بتادیں اور یقیناً اس نے ویسے ہی سب زبیر کو بتا دیا ہو گا۔

ہرن مینار کی تاریخی عمارتوں، چھانگا مانگا کے خود ساختہ جنگلوں اور مضافاتی ویرانوں میں اُن کی محبت پھلتی پھولتی گئی۔شراب سے لبالب بھرا کنستر خالی ہوتا گیا اور میرا خیال ہے جب یہ کھڑ کھڑ کرنے لگا اور اس کے شور سے زبیر کا سر دُ کھنے لگا تب ایک دن وہ ملائشیا چلا گیا۔

''وہاں تو اسے جانا ہی تھا۔کوثر نے محبت سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھے اور بولی۔

تمہیں میری باتوں کا غصہ لگا تھا مگر دیکھ لو حقیقت کا چہرہ کتنا بھیانک ہے۔یہی چہرہ میں نے تمہیں دکھانا چاہا تھا۔''

''مگر کوثر زبیر ایسا نہیں ہو سکتا۔اس نے تو میری سوچیں بدل ڈالی تھیں۔''

کتنے مہینے گزر گئے۔شائستہ کی بڑی بہن کا شوہر ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔وہ اس کے پاس چلی گئی تھی۔ہماری اس سے ملاقات کو عرصہ گزر گیا۔

مزمل اس رات عثمان کھانے لیے بیٹھا ہی تھا۔میں نے سالن کا ڈونگا ابھی میز پر رکھا تھا کہ شائستہ کا بھتیجا ایک خوبصورت سا کارڈ لے کر آیا۔میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔عثمان مجھ پر خفا ہونے لگا۔

''کیسی اوندھی بیوی ہو۔مجھے بھوک لگ رہی ہے اور اسے پڑھنے کی پڑی ہے۔ ارے بھئی۔''

اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

''روٹی لاؤ پہلے۔جاؤ بھاگو نکمی بیوی۔''

پر مزمّل میرے تو ہاتھ پاؤں جیسے پھول گئے تھے۔ میں نے عثمان کی منتیں کیں ۔''فارگاڈ سیک عثمان صرف ایک منٹ کیلئے کارڈ دے دو۔ میں صرف یہ دیکھ لوں کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔اور یقیناً تم بھی اسے پڑھ کر اُچھل پڑو گی۔ جیسے میں اُچھلی تھی ۔اس کی شادی زبیر کے ساتھ ہو رہی تھی۔مقام حیرت تھا نا!

شادی اس کی بڑی بہن کی کوٹھی میں ہونی طے پائی تھی ۔بارات آئی کم ہی لوگوں نے ایسی ٹھاٹھ باٹھ کی باراتیں دیکھی ہوں گی ۔ چڑھاوے کے زیور کپڑے ایک سے ایک بڑھ کر، ہیرے کی نتھ اور ٹیکا۔ میں نے اس کی نتھ میں لٹکتے موتیوں کو چھوا، رخساروں پر ہلکا سا ہاتھ پھیرا اور بولی ۔

''تم قسمت کی دھنی نکلی ہو۔''

اور جب زبیر آرسی مصحف کے لیے اندر آیا، اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں کونے میں کھڑی تھی ۔وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے میرے قریب آیا۔سر کو ذرا سا خم دے کر اس نے مجھے تعظیم دی اور بولا۔

''آپ نے میرے بارے میں غلط ریڈنگ کی تھی۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا اور رسان سے کہا۔

''کسی بڑی ہی نیک ماں نے کسی بڑی ہی شُبھ گھڑی میں تمہیں جنا ہوگا گر نہ رس چُوس کر پھوک کو کوئی گلے کا ہار نہیں بناتا ۔یہ دُنیا کی ریت ہے ۔یہ زمانے کا دستور ہے۔''

''میں نے اسے زبان دی تھی اور یہ ایک مرد کی زبان تھی کسی زنخے کی نہیں۔''

وقت کی ٹنل میں

''اللہ اگر کہیں چور ڈاکو ہمارے دو کنال پر پھیلے اس گھر کی پُروقار سی عمارت کی بیرونی شان وشوکت اور رعب داب کو دیکھتے اور ہمیں موٹی اسامیاں خیال کرتے ہوئے اندر آجائیں تو بیچارے کتنے مایوس ہوں گے کہ ننگے بُچھے کمروں کی الماریاں، صندوق اور پیٹیاں سبھی کتابوں اور لنڈے کے کپڑوں سے ناکوں ناک بھری پڑی ہیں۔

'بچ بچ' اُس نے زبان تالو سے لگا کر یہ آواز نکالنے اور چہرے پر خود ترسی اور ترحم آمیزی جیسی کیفیات پیدا کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے پانچ فٹ گیارہ انچ کے وجیہہ مرد کی طرف دیکھے بغیر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

ہائے ہاتھ جھاڑتے ہوئے یہی کہیں گے نا۔ ''ہے ہے کن فقیروں کے گھر آگئے ہیں۔''

زندگی کی حرارت اور سرشاری سے بھرپور منصور کا قہقہہ کمرے میں گونجا۔ جب اس قہقہے کی گونج ختم ہوئی۔ اُس نے قدرے تیکھے انداز میں بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں تھوڑا بہت سونا تو میرے ماں باپ نے تمہیں چڑھایا ہوگا۔ کچھ تھوڑا سا دوسری جانب سے بھی دان ہوا ہی ہوگا۔ اب اُسے الٹے تللّوں میں ضائع

کرنے کی بجائے ایک دو تولے سنبھال لیتا تھا۔ بچاروں کا مایوسی سے بچنے کا کچھ سامان تو ہو جاتا۔ اب رہیں کتابیں اور لنڈے کے کپڑے تو بھئی ایک عشق میرا ہے۔ دوسرا تمہارا۔ اب ہمیں ایک دوسرے کے عشق سے سمجھوتا تو کرنا ہے نا۔

اُس نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ خاموش ہو گئی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر کچھ اور کہے گی تو یہ سُنے گی۔

''جانم خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ اُس نے رہنے کو یہ خوبصورت سی چھت دی ہے جو یقیناً خدا کی عنایت کے بعد ہمارے والد گرامی کی محنت شاقہ اور رزق حلال کا نتیجہ ہے۔ ہنستے کھلکھلاتے گل کو تھنے سے بچے بھی دیئے ہیں۔''

اب ایسے میں وہ کسرِ نفسی کے طور پر اپنی ذات کو بیچ میں سے حذف کر جاتا۔ اگر وہ بھی یہ کہہ دیتا کہ ایسا لائق فائق خوبصورت اونچے عہدے پر فائز شوہر بھی تم جیسی معمولی صورت رکھنے والی عورت کو خدا نے دیا ہے جو بہر حال صد ہزار بار تمہارے لئے مقام شکر ہے۔ تو بھلا ایسی ننگی سچائی کے روبرو کچھ کہنے یا کسی بات کو جھٹلانے کی پوزیشن میں تھی کیا۔

ہوائیں نیچے لان میں سے رات کی رانی کے پھولوں کی ساری خوشبو تیر بلّھوں کی صورت اُڑ اُڑ کر کھڑکیوں کے راستے اندر آ رہی تھیں۔ اور وہ ناک کے نتھنوں کو پھُلاتا اس خوشبو کو لمبے لمبے سانسوں سے اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں تھا۔ چھت سے فرش تک لمبی کھڑکیوں سے لان میں جا بجا اُگے پھولوں کا دلفریب نظارہ بھی نگاہوں کو مسحور کرتا تھا۔

ایک طائرانہ سی نظر اُس نے کمرے پر ڈالی۔ کس قدر روکھا پھیکا سا تھا یہ۔ سوائے بیڈ روم کے کسی کمرے کی کھڑکی پر پردے نہیں تھے کہ اُس کے شوہر کے خیال میں فضول کی یہ شو بازی ہوا اور دھوپ کے راستے میں یونہی ٹانگیں پسار لیتی ہے۔ فرشوں پر میٹنگ بھی اُس کے خیال میں نری گندگی اور ڈسٹ الرجی کی پیدائش کا موجب تھی۔ کمرے میں یہاں وہاں

دھری زیبائشی اشیاء کا بھی کیا کام؟ ایسے ہی ان کی موجودگی کمرے کی کشادگی کی راہ میں حائل ہوتی تھی۔کبھی کبھی وہ جل بُھن کر خود سے کہتی۔یہ حجرہ شاہ مقیم کی اُس احمق مُیار جٹی سے کہیں مختلف ہے جو کہتی تھی:

گلیاں ہو جاون سنجیاں

تے وچ مرزا یار پھرے

کتاب سے اُسے عشق تھا اس لئے گھر میں اُن کی پرداخت ہونا لازمی امر تھا۔موسیقی کا وہ رسیا تھا بہترین کولیکشن کا ایک ڈھیر تھا اُس کے پاس۔اچھے کھانوں،اچھے لباس اور سیر سپاٹوں کا دلدادہ۔

شہر میں ہونے والے اوپیرا اور میوزک کنسرٹ کا ٹکٹ خریدنا اُس کے لئے کھانے کی طرح ہی ضروری تھا۔

فرض شناس اور ذمہ دار افسر تھا۔ایک نیمی گورنمنٹ ادارے میں اپنی تعلیم اور محنت کے بل بوتے پر جلد ہی کلیدی پوسٹ پر چلا گیا تھا۔یہ پوسٹ ناجائز کمائی کے بہت سے راستوں کی طرف جاتی تھی۔پر اُس کے اکیسویں گریڈ کے ریٹائرڈ باپ نے اُس کی اور اپنے بقیہ بچوں کی پرورش خالصتاً رزق حلال سے کی تھی۔شوقیہ لوازمات بھی پورا کرنے ضروری تھے۔اپنی ساری ضروری مدوں کے لئے رقم نکال کر وہ بقیہ تنخواہ اُس کے ہاتھ میں تھما کر فارغ ہو جاتا۔

اب ایسے میں کچھ اپنا اور کچھ بچوں کا بھرم رکھنے کے لئے لنڈے جانا اور لنڈے کو گھر میں لانا کس قدر ضروری تھا۔

یوں وہ اس دریا کی قدیمی شناور تھی۔سالوں پہلے تقسیم کے بعد جالندھر کی مضافاتی بستیوں سے اُٹھ کر آنے والی اُس کی ماں، ماسیاں، پھوپھیاں اور ممانیاں جب لاہور جیسے

قدیم اور تاریخی شہر میں آ کر بسیں تو انہوں نے سب سے پہلے بُرقعے اوڑھے پھر اتواروں کو شوہروں اور بچوں کے ساتھ تانگوں میں لدلدا کر تاریخی جگہوں پر جانا اپنا معمول بنایا۔ گھروں میں واپس آ کر اگلے کئی دنوں تک اس شہر کا کانپور اور جھانسی سے مقابلہ ہوتا کہ جہاں انہوں نے اپنے محنت کش شوہروں کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا۔

پھر ایک دن ان پینڈو عورتوں نے ایک عجیب سی ایک ایکٹویٹی کی۔ یہ بہار کے دن ہی تھے۔ جب انہوں نے چھوٹے بچوں کو بڑے بچوں کی تحویل میں دیا۔ چھت پر ہولیں بھونے اور کھانے کے عمل میں انہیں مصروف کیا اور خود بُرقعے اوڑھ کر کہیں چلی گئیں۔

شام ڈھلے جب وہ نیچے اُتری۔ اُسے محسوس ہوا جیسے گزشتہ سال کی آسمان کے سینے پر دیکھی ہوئی قوسِ وقزح اُن کی انگنائی میں اُتری ہوئی ہے۔ فرش پر ریشمی کپڑوں کا بازار سا بکھرا ہوا تھا۔ خوشگوار حیرتوں کے ساتھ اُس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا۔ لمبی لمبی فراکیں، چھوٹے چھوٹے گھگھرے، اُن پر ہاتھ پھیرا۔ یوں لگا جیسے ہاتھ تو کہیں مکھن پر پڑے ہوں۔ جیسے کچی ملائی ہو اُن کے نیچے۔ سرسر کرتے پھسلتے دور تک چلے گئے تھے۔

اُس کی ماں جب اپنے حصے کا مال اُٹھا کر کمرے میں لائی تو وہ دیر تک انہیں پہن کر مٹک مٹک کر چھوٹے سے کمرے میں گھومتے پھرتے خود کو پڑھی ہوئی کہانیوں کی کوئی شہزادی خیال کرتی رہی۔

بس تو یہیں اُس کے اور لنڈے میں وہ تعلق اور ربط استوار رہوا جو آنے والے وقتوں میں اُس کے ہڈیوں گوڈوں میں بیٹھا۔ میٹرک تک تو جو ماں نے پہنایا اُس نے پہنا پر کالج جا کر اُس کے پر پھوٹے۔ مصنوعی جیولری، کچے موتیوں، نایاب و نادر اشیاء اور بہترین کپڑے کی زیرِ زمین دوکانیں سبھی اُس نے کھوج لیں۔ کالج میں اُس کے سویٹروں اُس

کے انتہائی قیمتی شفون کے ڈوپٹوں اور قیمتی قمیضوں کی دھوم تھی۔

آغاز میں تو کوئی اُس کی قیمتی قمیض یا سوئیٹر کو شانے سے چٹکی میں پکڑ کر اگر یہ کہتے ہوئے ''اُف بھئی کس قدر شاندار ہے۔ کہاں سے لیا ہے؟'' جیسا استفسار کرتا تو وہ بڑی بیچ پٹری بنتے ہوئے آنکھوں میں معنی خیز مسکراہٹ کی چمک بھر کر ابروں اور کوہوں کو ٹھمکا لگاتے اور دائیں بازو کو پیچھے کی جانب لمبا سا جھلا رد یتے ہوئے ایک خفیہ اشارہ دیتی، جسے سمجھ کر مخاطب زور سے ٹھٹھا لگاتا۔

پر پھر اُس نے جانا کہ یہ تو کھوتا کھوہ میں ڈالنے والی بات ہے۔اسی لئے یونیورسٹی کے زمانے میں یورپ کے مختلف ملکوں میں اس کے بے شمار چچا ماموں سٹیل ہو گئے تھے جن کی وہ بڑے دلاری بھانجی بھتیجی آئے دن ان کی جانب سے تحفے وصول کیا کرتی۔

امریکن یونیورسٹی بیروت میں قیام کے دوران ایک بار جب پاکستانی طلبہ کی پاکستانی سفیر کی رہائش گاہ پر ڈنر کے موقع پر سفیر کی بیگم نے اُس کی قمیض کے کلر کمبی نیشن اور کپڑے کی تعریف کی تو اُس نے شکر یہ کہتے ہوئے دل میں کہا۔

''لو بھئی قیمت وصول ہو گئی اس کی تو۔''

اُسے یاد آیا تھا۔خدایا کس قدر تکرار ہوئی تھی دوکاندار سے۔اُس کی طرف سے پیش کردہ قیمت پر وہ دیدے گھما کر بھناتے اور اُسے ایک طرح پھٹکارتے ہوئے بولا تھا۔

''بابا معاف کرو۔بیچا نہیں جا ٹو۔آگے جاؤ۔تم کو کچھ معلوم نہیں کپڑے کا۔''

وہ بھی اول نمبر کی ڈھیٹ ہڈی تھی۔بحث کرتے ہوئے دل میں اُسے صلواتیں سناتے ہوئے ''کمبخت سُور کا بچہ۔تم سے تو زیادہ پہچان ہے مجھے۔جانتی نہ تو تیری دو دو ٹکے کی باتیں سُنتی۔''

ایک دھیلا کم نہ ہوا۔اُس نے بھی صبر شکر کے مصداق خرید لیا۔

اُس کا کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ذہن کپڑا ہاتھ میں پکڑتے ہی اس کی ڈیزائننگ کرتا۔ کاریگر ہاتھ اس کی مہارت اور عمدگی سے سلائی کرتے۔ اور تن پر سج کر وہ اپنے کسی اعلیٰ نسل سے ہونے کا چیخ چیخ کر اعلان کرتا۔

وہ پھیکے پکوانوں سے اونچی دوکانیں سجانا سیکھ گئی تھیں۔ مختلف زبانوں سے نکلتے تحسین آمیز کلمات اور کہیں نگاہوں سے چھلکتے تحیر زدہ جذبات، اس قربت میں ایک ایسا تسلسل تھا جو شادی کے بعد بھی جاری رہا۔

منصور سے شادی بھی ایک ڈرامے سے کم نہ تھی ----------------

اماں بوکھلائے پھرتی تھی۔ جوان کماؤ بیٹی جس کی روٹیاں تو اگرچہ ان کے منہ کو نہیں لگی ہوئی تھیں۔ کہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق کے باوجود مختصر سا خاندان ہونے اور ہر فرد کے کام کرنے کی وجہ سے گھر میں خوشحالی سی تھی پر ایسی اونچے درجے کی پڑھی لکھی بیٹی کو کھل کر ڈانٹ ڈپٹ اور پھٹکار بھی نہ سکتی تھی۔

''اے بیٹی سنو تو!'' وہ تھوڑی تھوڑی بعد ملتجی سے لہجے میں کہتی۔

''اماں! جو تم مجھے سنانا چاہتی ہو وہ میں نہیں سنوں گی۔''

وہ بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہتی اور ادھر اُدھر کام میں مصروف ہو جاتی۔

''تمہارا خیال ہے تمہارے لئے کوئی شہزادہ آسمان سے اُتر کر آئے گا؟'' ماں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تلخی پر اُتر آتی تھی۔

''شہزادے شہزادیوں کے لئے اُترا کرتے ہیں۔ میں ٹھہری ایک مزدور آدمی کی بیٹی۔ میری سوچ کی اُڑان اتنی اونچی کیسے ہوسکتی ہے؟''

وہ فرش پر پسکڑا مارے ایک بڑی سی شیٹ پر گاؤں کی ایک گلی میں گزرتے ہوئے بہشتی کی تصویر بنا رہی تھی۔ بھاری مشک سے بوڑھی کمر دُہری ہوئی جاتی تھی۔

''دیکھ بیٹی اچھے رشتوں کا قحط پڑا ہے۔ایک انا رسو بیمار والی بات ہے۔اپنے رشتہ دار ہیں دیکھے بھالے لوگ جن سے کوئی خطرہ نہیں۔''

''کوئی نہیں قحط وحط۔وقت آئے تو سبھی کچھ مل جاتا ہے۔''

اماں نے اس کی اس بات پر انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ لی اور طنز سے بھرپور لہجے میں اُس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''ابھی وقت آنا ہے کیا؟ تمہاری ابھی شاید عمر نہیں۔پچیس تو کب کی پاٹ چکی ہو۔چند سال اور گزر گئے تو کوئی گھاس بھی نہ ڈالے گا۔''

اور اب اس کے تلملانے کی باری تھی۔۔۔مار کر زمین پر پھینکتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کوئی گھاس ڈالے یا نہیں تمہاری منتیں نہیں کروں گی اماں۔''

وہ کمروں میں پھنکارتی پھری۔پھر کسی دوست کے ہاں چلی گئی۔شام پڑنے پر لوٹی تو ماں بھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اُس نے جا نماز اُٹھائی اور پلنگ پر لیٹی ہوئی بیٹی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔اُس کے چہرے پر پھونک مارتے ہوئے بولی۔

''آخر اس انکار کی وجہ تو بتاؤ!''

''اماں تم میری شادی کرنا چاہتی ہو۔کر دو۔مگر یہاں نہیں کسی اور جگہ۔''

''بچی میرے پاس رشتوں کی بھرمار ہے کیا؟۔۔۔جو اُسے چھوڑ کر کسی اور کو پکڑوں۔''

''ایک تو اماں آپ نے اُن کی نیک نامیوں کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا ہے کہ مجھ جیسی کسی حد تک آزاد خیال لڑکی اُلجھن میں پڑ گئی ہے۔سچی بات ہے اماں یہ دیندار لوگ بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔جینا حرام کر دیتے ہیں۔میرا بھلا کہاں گزارہ ہو گا اُن کے ساتھ؟''

اماں تو ہکا بکا سی ہو گئیں۔ان کی بیٹی کیسی طرّم خان بنی ہوئی تھی۔تلملا کر بولیں۔

''تو یوں کہو تمہیں لُچے لفنگے انسان چاہئیں۔

لاکھ بار تمہیں سمجھایا ہے کہ اپنے رشتہ دار ہیں۔پرانی باڑ کو نیا چھاپا لگنے والی بات ہے۔لڑکے کے والدین دل سے خواہش مند ہیں۔''

''اُن کی خواہش کو چاٹوں جب کہ لڑکا رضامند نہیں ہے۔''

اور ماں نے بوکھلا کر اُسے دیکھا اور کہا۔

''لڑکا کبھی ہمارے ہاں نہیں آیا۔تم اُن کے گھر کبھی نہیں گئیں تو پھر یہ پسند ناپسند کا چکر کیسا ہے؟''

''تم تو میری جان کو آ گئی ہو ماں۔میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔''

وہ جزبز ہوتے ہوئے اُس کے پاس سے اُٹھ گئی۔پر اُس کے کانوں نے سرد آہ میں ڈوبی یہ آواز سن لی تھی۔

''سیانے لوگ سچ کہتے تھے لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا ٹھیک نہیں۔وہ نکیل جو مجھے اس کی ناک میں ڈالنی چاہیے یہ میرے ناک میں ڈالے ہوئے ہے۔اس لئے کہ یہ ایم۔اے پاس ہے۔''

اور وہ یہ سب اُسے بتا کر اپنا فضیحتا نہیں کروانا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال اُسے ایک بڑے گرامر سکول کے جونیئر سیکشن کی انچارج کی جاب ملی تھی۔اُس دوپہر جب بچوں کے والدین سے ڈیل کرتے کرتے وہ اُکتا گئی تھی۔اپنے آفس میں کُرسی کی پشت سے سر ٹکا کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔برقی پنکھے کی ہوا خوشگوار تھی اور اُس کی ناک سے لگا گلاب کا وہ پھول جسے صبح سویرے ایک چھوٹی سی بچی نے اُسے پیش کیا تھا،بھینی بھینی خوشبو دے رہا تھا۔اُس نے آنکھیں کھول کر پھول کو بغور دیکھا۔اس کی صبح

والی بشاشت غائب تھی۔ عین اُس وقت ایک فربہی جسم کی عورت اندر آئی۔ وہ اپنے بچے کو سیکنڈ سٹینڈ رڈ میں داخل کروانے کی خواہش مند تھی۔

''یہ تو ممکن نہیں۔ ایڈمیشن کا وقت نہیں اب۔'' اُس نے بے اعتنائی سے کہا اور میز پر رکھے پیپر ویٹ کو گھمانے لگی۔

''میرا بیٹا آپ کے کزن کا کلاس فیلو اور دوست ہے۔''

خاتون نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنی چاہی، مگر اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار پا کر وہ جلدی سے بولی۔

''منصور احمد مکینیکل انجینئر!''

''اُس نے آپ کے بارے میں مجھ سے بات کی تھی۔ اُسے میرے بیٹے کے ساتھ خود آنا تھا۔ مگر کسی ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکا۔''

وہ دونوں کہنیاں میز کی چکنی سطح پر ٹکائے ہتھیلیوں کے ہالے میں ٹھوڑی جمائے اُس خاتون کو بغور دیکھ رہی تھی۔ یہ سُن کر اپنے آپ سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''اگر اُسے آنا تھا تو پھر بھلا تم کا ہے کو چلی آئیں۔ اچھا تھا اُسے اس بہانے دیکھ ہی لیتی۔ اماں جو دن رات تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی ہیں۔ پتہ چل جاتا کتنے پانی میں ہے؟

منصور احمد کے ساتھ اس کی قرابت داری بہت نزدیک کی نہ سہی بہت دور کی بھی نہ تھی بس درمیان ہی میں کہیں اٹکی ہوئی تھی۔ منصور کے والد کے مختلف اسٹیشنوں پر رہنے کی وجہ سے آمد ورفت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ جب سے لاہور تبدیل ہو کر آئے تو میل ملاپ شروع ہوا اور وہ بھی صرف بڑوں کا۔ بچے نہ اُن کے کبھی آئے اور نہ کبھی وہ لوگ گئے۔

ماں کا کہنا تھا کہ منصور کے والدین اس کے رشتے کے متمنی ہیں۔ گو اُنہوں نے

ابھی کھل کر بات نہیں کی، تاہم اشاروں کنایوں سے پتہ چلتا ہے۔

اس نے خاتون کو داخلے کے قواعد وضوابط سمجھائے۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو عورت نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو لمبے چوڑے چکر ہیں۔ میرا بیٹا کل آئے گا وہی آپ سے بات کرے گا۔''

اگلے دن کوئی گیارہ بجے وہ آفس میں بیٹھی تھی کہ چپڑاسی نے ایک چٹ لا کر دی۔ اُس نے پڑھی۔ انگریزی کے کیپٹل حروف میں منصور احمد لکھا ہوا تھا۔ وہ کوئی نوخیز سی بالی عمر کی لڑکی تو نہیں تھی کہ یوں نروس ہوتی پر بھی اس کا چہرہ قدرے سرخ ہوا۔ دل کے دھڑکنے کی رفتار بھی تیز ہوئی۔ اُس نے ٹھنڈے پانی کا لبالب بھرا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ چپڑاسی خاموشی سے منتظر نظروں سے عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آدھا پانی پی چکنے کے بعد وہ بولی:

''جاؤ انہیں اندر بھیج دو!''

دو خوش پوش سے نوجوان اندر آئے اور اُس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور احمد کون سا ہے؟ یہ اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ ساتھی لڑکے نے اپنے بھائی کے متعلق بات شروع کر دی تھی۔ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ اُس نے دل میں سوچا۔

وہ بلاشبہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ خدوخال دلکش اور اعضاء سے مردانہ وقار ٹپکتا تھا۔ اُس نے متانت اور سنجیدگی سے ساری کاروائی اُنہیں سمجھائی۔ ایک دو بار اُس کا دوست کلرک کے پاس بھی گیا۔ مگر وہ یہیں آفس میں ہی بیٹھا رہا۔ ہلکی پھلکی باتیں ہوئیں۔ جانے لگے تو اُس نے میز پر پڑی ڈیل کارنیگی کی کتاب How to win friends اُٹھائی اور اس سے مخاطب ہوا۔

''نوازش ہو گی اگر چند دنوں کے لئے مجھے یہ کتاب عنایت کر دیں۔ مدت سے

اس کی تلاش تھی۔''

اُن کے چلے جانے کے بعد وہ مسکرائی ۔اُسے منصور احمد پسند آیا تھا۔

چلچلاتی گرمیاں آئیں۔ برکھارت گزری۔ پھر دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوئیں ۔ایک دن جب آسمان گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا اور سرما کی پہلی بارش کسی بھی لمحے متوقع تھی ۔وہ بہار کے کسی معطر جھونکے کی طرح اُس کے آفس میں داخل ہوا۔

اس نے کتاب میز پر رکھی اور اتنی دیر بعد لوٹانے پر معذرت کی ۔انہوں نے چائے پی ۔اس نشست میں اُن کے درمیان گھریلو باتوں کا ذکر ہوا۔رشتہ داروں پر بھی مختصر تبصرہ کیا گیا ۔اُس نے اپنی ماں کے بارے میں کھُل کر بات کی وہ سخت مزاج خاتون ہیں۔ یہ بتانے میں بھی کوئی تامل نہ کیا کہ ماں کہتی ہے سوچ سمجھ لولڑکی بہت پڑھی لکھی ہے۔زیادہ پڑھ کر لڑکیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے کے قابل نہیں رہتیں۔

وہ ہنسی اور بولی:

''آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کی والدہ کا نقطۂ نظر کس حد تک درست ہے؟''

''فی الحال میں نے ابھی اس پر غور نہیں کیا۔'' اُس نے سادگی سے کہا اور اس موضوع پر گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ وہ پھر آیا۔ وہ کلاس چیک کرنے گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو اُسے آفس میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''ارے'' اُس پر نظر پڑتے ہی اُس کے دل میں عجیب سی جل ترنگ ہوئی ۔جس نے اُس کا چہرہ بھی تھوڑا سا گُلرنگ کیا اور آنکھوں میں بھی دیئے کی لو سی چمکی۔

''کب سے آئے ہیں؟ چپڑاسی سے کہہ کر مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

بیٹھنے کے ساتھ ہی اُسے محسوس ہوا تھا کہ وہ خاموش ہے اور کچھ کومگو جیسی کیفیت سے دوچار ہے۔اُس نے خود ہی ہمت کی اور پوچھا۔

''کیابات ہے؟''

''میری منگنی میرے چھوٹے چچا کی بیٹی سے ہوگئی ہے ۔ دراصل ننھیالی اور ددھیالی رشتہ داروں میں ٹھن گئی تھی ۔حالات اتنے نازک ہوگئے تھے کہ فوراً کوئی عملی قدم اُٹھانا پڑا۔''

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔گم سم اُسے دیکھتی رہی۔ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔

یہ ٹھیک تھا اُن کے درمیان محبت نہیں تھی ۔کوئی قول وقرار نہ تھا۔دوستی نہ تھی۔کچھ بھی تو نہیں تھا۔بس ماں نے اپنے خیال میں بات اتنی پختہ بنارکھی تھی کہ اُس کا ذہن بھی متاثر ہوچکا تھا۔خاص طور پر جب سے اُس نے اُسے دیکھا تھا۔

بڑی بوجھل تکلیف دہ اور ناگواری خاموشی کافی دیران کے درمیان چھائی رہی۔ پھر اُس نے اپنے سامنے دیوار پر آویزاں کلاک پر نگاہیں جماتے ہوئے قدرے مدھم آواز میں کہا۔

''ضروری نہیں شادی ہی ہو۔ہم اچھے دوست بھی ہوسکتے ہیں۔''

اور مانو جیسے آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے ہوں۔تیل کے کھولتے کڑاہے میں گرگئی ہو۔غصے سے اُسے پھٹکارتے ہوئے بولی:

''آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے؟میرا تعلق سوسائٹی کی جس کلاس سے ہے،اُس میں دوستیوں کے لئے کہاں گنجائش ہے؟یوں بھی یہ کالک اگر مجھے اپنے ماتھے پر لگوانی ہی ہے تو آپ اس کے لئے قطعاً موزوں نہیں ۔آپ جیسے ٹٹ پونجیے کی جیب دوستی کے اللّے تللّے

اُٹھانے کی بھلا محتمل ہوسکتی ہے؟''

اُسکے منہ میں جو آیا بولتی چلی گئی ۔لگتا تھا جیسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہو۔

وہ چپ چاپ سنتا رہا اور پھر اُٹھ کر چلا گیا۔

دونوں گھروں میں بڑوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اُسے پتہ چل گیا کہ اُس نے جھوٹ بولا تھا۔اُس کی کہیں منگنی ونگنی نہیں ہوئی تھی۔

اور یہ کیسا خوفناک انکشاف تھا؟ دُکھ اور کرب کی ایک لمبی لہر تھی جو اُس کا کلیجہ چیر گئی تھی۔

''اُس نے ایسا کیوں کیا؟ میں اُسے اچھی نہیں لگی تھی یا وہ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھتا تھا۔''

شرمندگی اور ندامت میں پورپور ڈوبے ہوئے سوالوں کا ہجوم تھا جو ایک کے بعد ایک اُس کے سامنے آتا۔خوفناک اور توہین آمیز تصویریں دکھاتا اور اُسے بےکل کر جاتا۔ بہت دنوں تک وہ تجزیوں کی سولی پر چڑھتی اپنے آپ کو لیر لیر کرتی رہی۔سوچیں کس قدر اندوہناک اور تلخ تھیں۔

''ارے میرے بارے میں اُس کی سوچ اتنی پست۔''جب وہ یہ سوال اپنے آپ سے کرتی تو اُس کی آنکھیں بھیگ سی جاتیں۔

وہ بڑی سلجھی ہوئی بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہیں وہ اُسے مل جائے تو اُس کا سر پھوڑ دے۔اُس کا بھرتہ بنا دے۔ذلیل کہیں کا۔دوستی کرنا چاہتا تھا۔حرامزادہ۔ڈھیروں گالیاں نکال کر وہ گویا اپنا اندر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی۔

اور اس اماں کو تو دیکھو۔۔۔میرا بیاہ وہاں رچاتی پھر رہی ہے۔۔۔

اُن دنوں وہ باؤلی ہوگئی تھی۔اماں معلوم نہیں کون کون سے وظیفے پڑھ کر اُس پر

پھونکتی۔کبھی وہ دم سادھے پڑی رہتی اور کبھی ہڑبڑا کر ہاتھ جھٹک دیتی۔

اور جس صبح وہ لوگ منگنی کی رسم ادا کرنے آرہے تھے رات گویا اُس نے کانٹوں پر گزاری۔ ساری رات آنسو اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔ ماں اُس کے آگے ہاتھ جوڑتی رہی۔عزت کا سوال پیدا ہوگیا تھا۔ صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ دن چڑھے اُٹھی تو دماغ میں عجیب سا خیال آیا۔

ظاہر ہے یہ سب اُس کی مرضی ہی سے ہو رہا ہوگا۔ لڑکا ہے زور زبردستی کا کیا سوال؟ اپنے کردار کے بارے میں وہ خلش اور چبھن جو اُسے ہمہ وقت بے چین رکھتی تھی، اس پر ٹھنڈی پھوار پڑ گئی۔

''چلو ہونے دو یہ سلسلہ۔ پوچھوں گی پھر کہ اُس نے آخر ایسا کیوں کیا؟''

اور پھر بینڈ باجے بجے، پکوان پکے، بہت سارے لوگ آئے اور اُن کے جلو میں وہ نئے گھر روانہ ہوگئی۔ شبِ عروسی کو اس نے روایتی دلہنوں کی طرح گھونگھٹ نہیں نکالا۔۔۔ وہ کمرے میں آیا، تو وہ صوفے پر تمکنت سے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر حجاب کی بجائے سنجیدگی طاری تھی۔ وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس نے وار کیا:

''یہ ڈھونگ آپ نے کیوں رچایا تھا؟''

وہ ہنسا، بوٹ کی ٹو سے فرش کو چند لمحے بجاتا رہا اور پھر اُس کی طرف دیکھ کر بولا:

''ایک تیز طرار لڑکی کو بیوی بنانے سے ڈر لگتا تھا۔''

''تو پھر بنایا کیوں؟''

''بڑوں کی خواہش تھی۔''

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ روندھے ہوئے گلے سے وہ بولی تھی۔

''سخت غلطی کی۔ انسان میں اتنی اخلاقی جرات تو ہونی چاہیے کہ وہ معاملہ جو خالصتاً اُس کی ذات سے متعلق ہو اُس کے لئے ڈٹ جائے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا پھر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس کے بالکل قریب بیٹھا۔ اپنی پوروں سے اُن آنسوؤں کو صاف کیا جو اس کی نچلی پلکوں سے لڑھک کر گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

''اس شادی میں ابو جان کے ساتھ ساتھ میری بھی سو فیصد رضامندی شامل ہے۔ میں تھوڑا بہت جھوٹا تو ہو سکتا ہوں پر بزدل ہرگز نہیں۔ اطمینان رکھو۔''

اُس کی شخصیت کی پہلی جانداری پرت شادی کی پانچویں رات اُس کے سامنے کُھلی۔ وہ لان میں اپنی ساس کے پاس کھڑی کوئی بات کر رہی تھی جب بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے منصور کا چہرہ باہر نکلا اور اس کا نام لے کر فوراً اُسے اوپر آنے کو کہا۔ ساس سے اجازت لے کر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی دو دو سیڑھیاں الانگتی پھلانگتی سانس کو لوہار کی دھونکنی کی مانند پھلاتی گراتی دہلیز پر آ کر کھڑی کیا ہوئی کہ اُسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں فرش کی بجائے اس پر دھری کسی میگنیٹ سلیٹ پر پڑے ہوں۔ اور وہیں چپک گئے ہوں۔ دروازے کے دونوں پٹوں کے بیچوں بیچ بے حس و حرکت کسی سنگی بُت کی مانند ایستادہ نظر آتی تھی۔

کمرے کا ماحول مرتعش سا تھا۔ سارے کمرے میں دل کو چھوتی موسیقی کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں پلکیں جھپکائے بغیر سحر زدہ سی سامنے دیکھتی تھیں جہاں موسیقار کے ہاتھوں کی ترتیب اور دماغی ترکیب مل کر سازوں سے نکلتے سُر جیسے بادِ صبا کے نرم و ملائم جھونکوں کا پھولوں کے تختوں پر سے دھیرے دھیرے بہنا جیسے ندی کے سبک خرام پانیوں کا ہلکی سی گنگناہٹ سے چلتے رہنا جیسا احساس دیتے تھے۔ پھر جیسے دل کو چھونے

والے مدھم سے جادو جگانے والے سروں کی جگہ ایک ایسی سمفنی فضا میں اُبھری جس نے پل جھپکتے میں ایک ایسا منظر تخلیق کیا کہ جیسے کہیں برق و رعد کی یلغار ہو۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہو۔ دل ڈوبتا ہو۔ کچھ لمحے اس کیفیت میں گزرے پھر ساز خاموش ہو گئے۔ ہیجان انگیز کیفیت کا تاثر زائل ہونے پر اُس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔ صوفے پر بیٹھی۔ اسّی کی دہائی میں چوبیس انچ چوڑی سکرین والے ٹی وی پر وی سی آر سے ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے ایسے پروگرام دیکھنا بالائی طبقے کے لوگوں کے لئے تو ممکن ہو پر عام آدمی کو تو اس کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

کسی تربیتی کورس پر وہ چھ ماہ کے لئے امریکہ گیا تھا۔ اپنی ساری بچت اُس نے اپنی ان دلچسپیوں کی نذر کر دی تھی۔

اور جب اُس نے یہ پوچھا تھا کہ جانتی ہو یہ سمفنی کس موسیقار کی تھی تو اُس نے احمقوں کی طرح سر نفی میں ہلایا۔

بیروت میں اُس نے دو میوزک کنسرٹ ضرور اٹینڈ کئے تھے۔ تھوڑا بہت سر ساز سے واقفیت بھی تھی پر ایسی ہرگز نہیں۔

وہ Mozart کا گرویدہ تھا۔ اُس کے گن گا رہا تھا کہ ابھی سُنی گئی موسیقی کا خالق موزرٹ تھا۔

صرف مغربی نہیں اُسے تو مشرقی موسیقی کا بھی خاصا علم تھا۔ جب وہ ترانہ، خیال، ٹھمری اور دادرا جیسی اصناف موسیقی پر باتیں کرنے اور اُسے اپنی کولیکشن دکھانے کے لئے کھڑا ہوا تو اُس نے دہل کر اپنے دل میں کہا۔

''مارے گئے۔ اللہ ایک تو اندر بھوک سے کلبلا رہا ہے۔ اوپر سے نیند آنکھوں میں جالے تان رہی ہے۔ نئے نویلے عروسی شب و روز انکار کروں تو کیسے؟'' بہر حال جی کڑا کے

اُس نے مدھم سی آواز میں اتنا کہا:

''منصور خالہ جان انتظار میں ہوں گی۔ اسے پھر کبھی دیکھوں گی۔''

کتاب سے اس کی محبت اور دلچسپی کمرے میں رکھی کتابوں سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔ پر وہ اس معاملے میں اتنا گریزی تھا، اس کا اندازہ اُسے اُس اتوار کو ہوا جب ساری فیملی حلوہ پوریوں کے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی۔ وہ پورچ میں آیا۔ گاڑی کی بجائے اُس نے چھوٹے بھائی کی موٹر بائیک سٹارٹ کی اور اُسے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ حق حیران کھڑی پوچھے چلی جارہی تھی کہ جانا کہاں ہے؟ ہاں دیکھو میں ذرا چینج تو کر آؤں۔

''ارے ٹھیک ہے سب۔ بیٹھو بیٹھو۔ اب اور کیا ہار سنگھار کرنے ہیں۔''

بگولے کی مانند اُڑتے ہنستے اُس نے اُسے انار کلی کے تھڑوں پر بکھری کتابوں کے درمیان لا پنچا۔

اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے کتابیں اُن شمعوں کی طرح ہیں کہ جن پر وہ کسی پروانے کی طرح ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اُٹھی تھیں۔ کتاب اُسے بھی پسند پر یہاں تو معاملہ عشق و عاشقی والا تھا۔ کتابوں کے چناؤ کے بعد اُس کی قیمت پر بحث و تکرار اس کا کام ٹھہرا۔ بھاؤ تاؤ کروانے میں تو وہ خاصی ماہر تھی۔ خوب خوب زبانیں چلیں۔ اُس کا تھیلا بھر گیا۔ اور جب وہ اُسے کیریئر کے ساتھ باندھ رہا تھا اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں مول تول میں ہمیشہ کا پھسڈی ہوں۔ تمہاری وجہ سے بہت سی کتابیں زیادہ خریدی گئیں۔''

کوئی اچھا ڈرامہ، کوئی میوزک کنسرٹ، کسی پُر فضا تفریحی مقام کی سیاحت، آفیشل ڈنرز بھوں میں سرگرمی سے شرکت کرنا اس کی زندگی کے معمولات کے ساتھ جُوے

ہوئے تھے۔

جب اتنے متنوع قسم کے مہنگے مشاغل ہوں اور تنخواہ کا بٹوارہ بھی ڈھیر ساری مدوں میں ہوتا ہو تو خاتون خانہ کو پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے پڑتے ہیں۔ساس نے تو دو ماہ بعد ہی یہ کہتے ہوئے اُن کا چُوٹھا چونکا علیحدہ کر دیا تھا کہ بس اب اپنا گھر سنبھالو۔بچے کی آمد بھی فوراً ہی ہو گئی۔منصور بڑا اجز بز ہوا۔

''لو بھلا ابھی اس کھڑاک کی کیا ضرورت تھی؟''

''حد کرتے ہو منصور۔'' وہ بھی بپھر سی گئی۔ ''جیسے اس کام میں میں اکیلی ہی تو شامل ہوں۔''

اُس نے جواباً جھلاتے ہوئے کہا تھا۔

''اُفوہ بھئی تم سمجھا تو کرو۔ذرا تھوڑا اور موج میلہ کر لیتے۔''

اُس نے مزید کوئی تلخ جواب دینے کی بجائے خاموشی سے اُٹھ جانا زیادہ مناسب سمجھا۔

معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہوا۔سرخ وسفید رنگوں والے identical twins آ گئے۔دو بیٹے۔اس مشکل مرحلے کو اُس نے اپنی ماں کی مدد سے سنبھالا۔بیٹی نے بھی آنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔بہر حال خاندان مکمل ہو گیا۔اوپر تلے کے بچوں کی مشکلات سے ذرا نکلی تو پارٹیوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔یہ پارٹیاں کیا تھیں فیشن شو۔کپڑوں اور زیورات کی نمائش۔تصنع اور بناوٹ سے پُر باتیں اور ماحول۔

اُس نے بھی اپنی ذہانت اور مہارت دونوں استعمال کیں۔اپنے بچوں کو وہ کپڑے پہنائے کہ یہی لگا کہ جیسے سینٹ مائیکل گارمنٹ فیکٹری سے ابھی ابھی تیار ہو کر آئے ہوں۔پھولوں جیسے بچے ایسے ملبوسات میں تتلیوں کی طرح اُڑتے پھرتے بڑے منفرد

نظر آتے۔

بچے جب کالجوں میں گئے تو اُس کے پاس وقت کی فراوانی ہوگئی۔اور یہ فراوانی اُسے ڈسنے لگی تھی۔کیا کروں؟ وہ بار بار خود سے پوچھتی۔منصور سے بات کرتی تو وہ کہتا۔

''بھئی جو کرنا ہے کرلو۔تمہاری اپنی ہمت ہے۔''

دو تین جگہ ٹیچنگ کے لئے کوشش کی۔کہیں تنخواہ کم تھی اور کہیں ڈیوٹی سخت۔طویل سوچ بچار کے بعد اُس نے بوتیک کا کام شروع کیا۔

خوش قسمتی شاید اسی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کب وہ کچھ شروع کرے اور کب وہ اس پر دھن، دولت اور کامیابیوں کی بارشیں کرے۔

آغاز میں کِن من، کِن من ہوئی۔شاید کام کی بنیادوں میں نیک نیتی اور اخلاص تھا پھر موسلا دھار ہونے لگی۔وہ جو سارا ماہ گھریلو بجٹ کو پلاننگ کی سوئی کے ماکے میں سے تھوڑی سی بچت کی خواہش میں گزارتے ہوئے ہانپ ہانپ سی جاتی اب کیسے بے نیازسی ہوگئی تھی۔بینکوں میں جانے ،قرضے لینے لاکھوں چھوڑ کر کروڑوں کے معاملات کی ڈیل اب اس کا معمول تھی۔

پر ایک بات ضرور تھی۔وہ دولت کی تقسیم پر ایمان رکھتی تھی۔اس کی زندگی صرف گوشت دالوں چینی پتی جیسی چیزوں کی مہنگائی ہی سے بے نیاز ہوئی تھی۔بقیہ سب معاملات اُسی سادگی اور کفایت شعاری کے مرہون منت تھے۔

بیٹی ابھی بی۔اے میں تھی جب اُس نے اُسے بیاہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔منصور بڑا اپسیٹ تھا۔

''منصور اچھے رشتوں کا کال پڑا ہوا ہے۔لائق لڑکوں کے والدین کی آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی ہیں سینکڑوں تو شرائط ہیں۔''

''تو تم ایسے لوگوں کو اہمیت کیوں دیتی ہو؟''

بہر حال یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جونہی بیٹی گریجوایشن سے فارغ ہوئی بہت اچھی جگہ سے رشتہ آیا اور وہ اس فرض سے فارغ ہوگئی۔

بڑے بیٹے نے باہر سے تعلیم مکمل کر کے واپس آنے پر خاندان کی ہی ایک لڑکی کو پسند کرلیا۔ اُس نے بھی خود سے کہا۔

''چلو اچھا ہی ہے۔ باہر آنکھ مٹکا لگا لیتا یا کسی تیز طرار کو لے آتا تو بھلا میں نے کیا کر لینا تھا۔ فیملی کی لڑکی ہے۔ کچھ تو رشتوں کا بھرم رکھے گی نا۔''

بڑے سے آدھ گھنٹہ چھوٹے لڑکے کی اُس نے دیور کے گھر نسبت ٹھہرا دی تھی۔

یوں گھریلو ذمہ داریوں کے بارے خاصی ہلکی ہوگئی تھی۔

پھر ایک عجیب اور حیرت انگیز سا واقعہ ہوا۔

اُس نے کسی پارٹی کو کچھ ایڈوانس پے منٹ کرنی تھی۔ دفتر سے اُٹھتے ہوئے اُس کے مینیجر نے پانچ لاکھ کی پانچ گڈیاں اُسے دیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پارٹی سے کچھ معاملہ طے نہ ہوا اور بینک کا ٹائم بھی ختم ہوگیا۔ وہ پیسے سمیت گھر آگئی۔ پرس میں سے رقم نکال کر اُس نے اُسے اپنے بیڈ سے ملحقہ دراز میں رکھ دی۔ دراز کا لاک خراب تھا۔ گھر کے نوکروں کی طرف سے اطمینان تھا۔ ایک دو دن مصروفیت میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن صبح سویرے اُس نے نماز کے بعد دراز کھولا۔ سامنے تھدیاں پڑی تھیں۔

''کمال ہے یار۔ لاپرواہی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' اُس نے اپنے آپ کو لعن طعن کی۔

اپنے سر کو تکیے پر گراتے ہوئے اُسے یونہی خیال آیا۔

اب اگر گھر میں کوئی چوری کی نیت سے آجائے اور دراز کھولے تو کتنا خوش ہو کہ

بغیر کسی تردد کے اتنا سارا پیسہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

ایسی اُلٹی پلٹی سوچیں سوچنے میں وہ ہمیشہ سے بڑی تیز تھی۔

بہر حال آج بینک جاتی ہوں۔اُس نے خود سے کہا۔

پر اُس دن محاورے کے مطابق سر اُٹھانے کا بھی وقت نہ ملا۔ایک بجے گھر آئی۔ کھانا کھایا۔نماز پڑھی۔تین بجے اُسے پھر کہیں جانا تھا۔جب وہ جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی اُس نے دراز کھول کر پیسے نکالے انہیں ایک لفافے میں ڈالا اور ریک کے اوپر والے خانے میں خوبصورتی سے چُنی گئی کتابوں کی دیوار کے پیچھے چُھپا دیا۔

ساڑھے سات بجے اُس کی واپسی ہوئی۔ٹی وی لاؤنج میں گھر کے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔پر نہ تو ٹی وی دیکھا جا رہا تھا اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی بات چیت تھی۔بڑے صوفے پر منصور کے ساتھ بہو تھی۔سامنے چھوٹا بیٹا۔عجیب سی پُر اسراریت اور پژمردگی کا سا ماحول محسوس ہوا تھا شاید اسی لئے اُس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں ہاں بیٹھو۔''منصور بہو سے مخاطب ہوئے۔

''اپنی آنٹی کو بتاؤ''۔منصور بہو سے مخاطب ہوئے۔

خدایا خیر ہو۔اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔

فریحہ(بہو) کے چہرے پر ہمہ وقت دوڑنے والی شوخی اور چلبلا پن غائب تھا۔ بُجھی بُجھی تھی۔آواز بھی روکھی سی تھی جب وہ بولی۔

''آنٹی غضنفر(شوہر) کا کوئی ساڑھے چار بجے فون آیا۔رات کے کھانے پر اُس کے تین دوست آ رہے تھے اور کڑہی کی فرمائش بھی تھی۔میں کچن میں آئی کچھ چیزیں نہیں تھیں۔میں نے وحید(ملازم) کو مطلوبہ چیزیں لکھ کر دیں کہ وہ لے آئے۔پروین ابھی

کوئی تین بجے اپنے کواٹر میں گئی تھی سوچا کہ ابھی ٹھہر کر اُسے بُلواتی ہوں ۔خود میں نے پیاز کا ٹنا شروع کر دیا ۔مدھم سی قدموں کی چاپ پر میں نے نے یونہی سر اُٹھا کر دیکھا۔''

اس کے سامنے بیٹھی فریحہ نے خوف سے یوں جھرجھری لی کہ ایک لمحے کے لئے وہ بھی کانپ اُٹھی ۔

میرا سانس میرے سینے میں کہیں اٹک گیا تھا۔ میری آنکھیں دہشت سے خوفناک حد تک پھیل گئی ہوں گی ۔ میں پتھر کی طرح ساکت اپنے سامنے دہلیز میں کھڑے ایک لمبے چوڑے سیاہ نقاب پوش جس کے ہاتھ میں پکڑا پستول میرا نشانہ لئے ہوئے تھا دیکھی تھی ۔وہ آگے بڑھا۔اندر آیا۔اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اُن میں سُرخی تھی ۔ اُس کا لہجہ دُرشت تھا اُس نے پوچھا۔

''تمہارا زیور کدھر ہے؟''

''پل بھر کے لئے میری آنکھیں بند ہوگئیں ۔پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا خدا کہیں میرے بہت قریب ہے اور اُس کے فرشتوں نے میری حفاظت کے لئے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔''

جب میں نے آنکھیں کھولیں میں حوصلے میں تھی ۔اُس نے اپنا سوال تلخ لہجے میں دوبارہ دہرایا۔

''تُم نے سنا نہیں میں نے کیا پوچھا ہے؟''

''میرا زیور میری ماں کے گھر ہے۔''

''جھوٹ بولتی ہو۔فوراً بتاؤ۔ورنہ ابھی کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''

مجھے قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔ میں نے دلیری سے کہا۔

''جھوٹ کیوں بولوں گی ۔میرے کان، ناک، کلائیاں، گلا سب دیکھو ننگے بُچھے

ہیں۔"

''کیش کہاں پڑا ہے؟'' اس بار اُس کے لہجے میں خفیف سی نرمی تھی۔

''یہ لوگ کیش گھر میں نہیں رکھتے۔''

''اندر چلو! وہ رُخ پھیر کر میری پُشت پر آیا۔ پستول کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ میں ٹی وی لاؤنج میں سے گزر کر آپ کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔''

''اب میں نے اُس کا دوسرا ساتھی بھی اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا اور اُس نے خاکی پرنے سے اپنا منہ سر ڈھانپا ہوا تھا۔ اُن کی آپس کی بات چیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ گیٹ پر بھی اُن کے دو ساتھیوں کا پہرہ ہے۔''

''انٹی آپ کے کمرے کو انہوں نے جس تنقیدی انداز میں دیکھا، اُسے میں نے بھانپا تھا۔ اب ذرا دیکھیے نا۔ ریک کے چاروں خانوں میں کتابیں۔ بیڈ کے سرہانے میں جو خلا اس میں کتابیں، اُس کے اوپر کتابیں۔ میز پر کتابیں، شیشے کی الماری کے خانوں سے جھانکتی کتابیں۔

''کس کا بیڈ روم ہے؟''

سفید کپڑوں والے نے بڑے استہزائیہ انداز میں پوچھا تھا۔

''میرے ساس سسر کا۔''

''بڑے پڑھاکو لگتے ہیں۔'' پہلے والے کے لہجے میں حقارت بھری کاٹ تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں عجلت میں کھولی گئیں۔ ایک میں ڈھیر ساری استعمال شدہ جرابوں کے جوڑے، نفرت سے اُٹھا کر فرش پر پھینک دیئے گئے۔ دوسری میں مختلف چھوٹے بڑے ڈبے کسی میں دھاگے اور کسی میں بٹن۔ غصے سے انہیں بھی پھینکا گیا جو میٹ پر لوٹنیاں کھاتے پھرے۔ بیڈ کی درازوں کو کھولا گیا جن میں الم غلم بھرا ہوا تھا۔ کتابوں کے

پاس ضیغم کا موبائل پڑا تھا۔ اُسے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

انہیں کچھ نہیں مل رہا تھا۔ جھنجھلاہٹ ایک اضطراب ان کی حرکات سے مترشح تھا۔ خدا گواہ ہے اُس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں سے سات آٹھ ہزار روپیہ ہی انہیں مل جائے تھوڑی سی تو ان کی تسکین ہو۔ بیڈروم سے تو ہاتھ جھاڑ کر نکلنے والی بات تھی۔ دونوں پھر ٹی وی لاؤنج میں آ کر کھڑے ہوئے۔ ضیغم والے کمرے میں منصور ماموں گہری نیند سو رہے تھے۔

''یہ کون ہیں۔'' استفسار ہوا۔

''میرے سسر ہیں۔'' پتہ نہیں انہوں نے میرا جواب سنا یا نہیں۔ وہ سٹور میں گھس گئے تھے۔

الماری کو کھولا۔ خانوں میں تہہ شدہ اور ہینگروں میں کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دفعتاً انہیں سیف نظر آیا۔ اُسے کھولا۔ اندر لاک شدہ خفیہ خانے تھے۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی بھر جائے کچھ ایسی ہی کیفیت ان کے چہروں پر ظاہر ہوئی۔

''چابیاں کدھر ہیں؟ فوراً لاؤ۔''

اب میں بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے کہتی ہوں۔

''یقین کرو مجھے نہیں پتہ۔''

''اُلو کی پٹھی بکواس کرتی ہو۔ کیسی بہو ہو؟ گھر میں رہتی ہو یا سرائے میں۔''

''میری ساس بہت dominating عورت ہے۔ میرے ہاتھ تو صرف روز کا خرچہ پکڑاتی ہے۔ تم ان کے تالے توڑلو اللہ کرے اندر کچھ ہو۔''

سفید کپڑوں والے نے طیش میں بیچ پر پڑے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں کو اُچھالا اور شعلے برساتی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہاں کیا فقیر رہتے ہیں؟ منگتوں کا گھر جان پڑتا ہے۔''

دو قدم آگے بڑھا کر پھر پلٹا۔

''جی چاہتا ہے بھٹ مار کر تمہارا سر پھوڑ دوں۔''

اور یہ خدا کا کس قدر احسان عظیم تھا کہ وہ گولی چلائے اور میرا بھیجا کسی بٹ سے کھولے بغیر جیسے آئے تھے ویسے چلے گئے۔

اور جب بہو کا مُو مُو تشکر کی پھوار میں بھیگا اُس کے پورے وجود کو عجز کی صورت نمایاں کرتا تھا وہ اُٹھی۔ بہو کے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ دے کر اُس نے کتابوں کے ریک میں رکھے گئے لفافے کو ہاتھ کی پوروں سے چھو کر اس کے وہاں ہونے کے یقین کو مزید تقویت دیتے ہوئے کمر سیدھی کی۔ واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھی۔ چُپ چاپ۔ ساکت بے حس و حرکت بظاہر نظریں فریحہ کے چہرے پر جمائے پر حقیقتاً کہیں بہت دور پیچھے گزرتے ہوئے وقت کی اُس منزل میں جہاں وہ منصور سے کہتی تھی۔

''اللہ اگر چور ڈاکو ہمارے گھر آ جائیں تو کیا کہیں گے کہ ہم کن فقیروں کے ہاں آ گئے ہیں۔''

کیا سمے کی اُن لہروں میں کوئی جادوئی اثر تھا جنہوں نے لفظوں کو اپنی لپیٹ میں مدتوں جکڑے رکھا اور پھر اُن کا سحر ختم ہونے پر کسی اور زبان سے فضا میں اُچھال دیا۔

کیسی حیرت انگیز بات تھی۔

دیکھئے ہوتا ہے کیا

دونوں بھائیوں میں ٹھن گئی تھی۔کج بحثی اور دلائل پر اُتر آئے تھے۔توصیف نے ٹھنڈے پانی کا لبالب بھرا گلاس جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر کی گیارہ سالہ نوکرانی سائیڈ ٹیبل پر رکھ گئی تھی اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔پانی نے اتنی ٹھنڈک نہیں دی جتنی اُسے مطلوب تھی۔

''موئی''۔اس نے زور سے آواز دی۔

اور جب دہلیز میں خوب صحت مند جسم کی ایک لڑکی آ کر کھڑی ہوگئی۔وہ قدرے تلخی سے بولا۔

''میں نے تمہیں خوب ٹھنڈا پانی لانے کو کہا تھا اور تم نیم گرم پر مجھے ٹرخا گئی ہو۔

''بھائی جان جی۔۔۔'' اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو توصیف نے کچھ سننے کی بجائے تیزی سے کہا۔

''جاؤ۔بھاگ کر فریج میں سے بوتل نکال لاؤ۔''

''ارے بھئی کیا دیکھا ہے تم نے اس میں؟اتنی حسین نہیں کہ انسان کہے دیکھ کر نظر خیرہ ہوتی ہے۔اتنی پڑھی لکھی نہیں کہ آدمی یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ بھئی علم تو ہے۔ گھر گھرانہ بھی تمہارے سامنے ہے۔''

آصف نے بیڈ کی پائنتی پر رکھے تکیے کو دوہرا کرتے ہوئے اک ذرا طنز سے بھائی کو دیکھا اور بولا۔

''یہی سوال آپ سے بھی تو کیا جا سکتا ہے۔آپ نے نسرین باجی میں کیا دیکھا تھا؟اتنی حسین نہیں،علم والی نہیں،امیر والدین کی بیٹی نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کندن چچا آپ کے لئے ایک اچھے گھر کا رشتہ لائے تھے اور مُصر تھے کہ آپ کی بات وہاں پکی کر دی جائے مگر آپ نے کندن چچا کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھ کر دھیمی مگر مضبوط آواز میں کہا تھا۔

''فضول میں ٹکریں مت ماریں کندن چچا،نسرین میرے سگے ماموں کی بیٹی ہے،مجھے پسند ہے،میں شادی صرف اسی سے کروں گا۔''

آصف نے اپنا سر تکیے پر گرا دیا۔آنکھوں پر بازو رکھ لئے اور دھیمی مگر مضبوط آواز میں بولا۔

''یہی بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں توصیف بھائی کہ مجھ سے اس مسئلے پر مت اُلجھیں۔پروین میرے ماموں کی بیٹی ہے،مجھے بہت پسند ہے اور میں شادی صرف اسی سے کروں گا۔''

دونوں خاموش تھے۔توصیف بھی بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔کمرے میں کافی دیر تک گھمبیر سی خاموشی چھائی رہی۔دیر بعد توصیف نے ایک اور وار کیا۔

''تمہیں شاید علم نہیں امی جان رضامند نہیں ہیں۔''

''وہ تمہاری بار بھی کب رضامند تھیں؟'' آصف نے تڑکی بتڑکی جواب دیا تھا۔

''میرے ساتھ مقابلہ کرنے کی شاید تم نے قسم کھالی ہے۔'' توصیف جھنجلا اُٹھا تھا۔

''دماغ اُلٹ گیا ہے آپ کا۔ مقابلے والی اس میں کون سی بات ہے؟ ایک چیز مجھے پسند ہے میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں آپ دلائل دے رہے ہیں کہیں امی جان کے حوالے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے بتایئے شادی میں نے کرنی ہے۔ امی جان کو کیا اعتراض ہے؟''

''اُن کا کہنا ہے کہ وہ ایک گھر کی دو لڑکیاں نہیں لانا چاہتیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ پروین طبیعت کی تیز ہے۔''

''اور آپ کچھ اپنے بارے میں بھی فرمایئے!''

آصف کے جلے کٹے لہجے کی توصیف نے پرواہ نہیں کی۔ نرمی سے بولا۔

''اصل میں نو عمری انسان کو جذبات کی کٹھن گھیریوں میں اُلجھا دیتی ہے۔ وقت اور تجربات کے تھپیڑے ہی اُسے سمجھاتے ہیں کہ اس نے کب اور کس مقام پر غلطیاں کی ہیں؟ والدین اگر زیرک ہیں تو بہت سے مقامات پر ان کا تدبر اولاد کا مستقبل سنوار دیتا ہے۔''

''اس تقریر سے مجھے کیا سمجھانا مقصود ہے؟'' وہ غالباً اس وقت کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ کہ ہم جیسے غریب گھروں کے ہونہار اور لائق لڑکوں کو اگر مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ مل جائے تو زندگی گزارنے کا یہ گھسا پٹا انداز بدل سکتا ہے۔''

''میں مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں نے معمّوں میں تو بات نہیں کی۔'' توصیف قدرے بگڑ کر بولا۔

''نسرین سے شادی کرتے وقت اگر میں یہ جان لیتا کہ مجھے مستقبل میں ترقی کے زینے پر چڑھنا ہے اور ہمارے ملک میں یہ زینہ چڑھنے کے لئے ذاتی محنت اور کوشش سے

زیادہ بیک پشنگ چاہیئے تو عین ممکن ہے کہ میں کندن چچا کا مشورہ مان لیتا۔میری پروموشن کا کیس سال بھر سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔سینئر منیجر اشارۃً کہہ بیٹھے ہیں کہ کوئی سفارش ہے تو منسٹر سے کہلوا لو۔فائل نکل آئے گی۔مگر میں توصیف احمد ہیڈ کلرک احمد دین کا بیٹا منسٹر جیسے اونچے آدمی کے لیول کی سفارش کہاں سے لائے؟

تم ڈاکٹر بنے ہو۔باہر جانے کے لئے کوشاں ہو۔تمہارا مستقبل خوش آئند ہے۔اس میں اورنا بنا کی آ سکتی ہے اگر ہم تمہیں کسی اونچی جگہ بیاہیں۔''

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔چند لمحے خاموشی سے بھائی کو دیکھتا رہا پھر تلخی سے بولا۔

''یہ شادی تو نہیں سودا بازی ضرور ہے۔''

''ارے بھائی آج کل ساری دنیا ان سودے بازیوں کے چکر میں ہی تو ہے۔''

''معاف کیجئے گا توصیف بھائی میں بلند ہمت انسان ہوں۔مجھے اپنے بازوؤں پر بھروسہ ہے۔ترقی کے زینوں پر اپنی مضبوط ٹانگوں سے چڑھوں گا۔''

اس نے گود میں رکھا تکیہ بیڈ کی پائینتی پر مارا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔مگر باہر جانے سے قبل دہلیز کے پاس رُک گیا۔کمرے میں اس نے تنقیدی نگاہ ڈالی۔

چودہ x چودہ فٹ کا یہ کمرہ جس کی دیواروں پر کیئے گئے ڈسٹمپر دروازوں اور کھڑکیوں پر جُھولتے پردوں، بیڈ پر بچھی چادروں، فرش پر بچھے کارپٹ اور دیگر چیزوں کے رنگوں میں ایک خوبصورت ہم آہنگی تھی۔اس کمرے میں کیا پورا گھر اندر سے سجا سنورا رہتا تھا۔گویا یہ دس مرلے کا گھر نہیں کنال کی کوٹھی ہو۔یہ سب تب سے ہوا تھا جب سے نسرین اس گھر میں آئی تھی۔آنگن کی دیواروں پر منی پلانٹ اور عشق پیچاں کی بیلیں پھیل گئی تھیں۔فرش ہر دم یوں چمکتے تھے جیسے وہ شیشہ ہوں۔گھر کے طور طریق اور ترتیب میں ایک حُسن اور سلیقہ آ گیا تھا۔تین بچوں کی ماں بھی ہر دم چاق و چوبند اور خُوش و خرّم نظر آتی تھی۔

''ہوں۔'' اس نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے زور سے طنزیہ ہنکارہ بھرا تھا۔

''یہ سکون وطمانیت کا گہرا احساس جوانسان کو باہر کی ساری پریشانیوں اور کوفتوں سے نجات دلاتا ہے اس کا کوئی بدل ہے؟ کوئی نہیں۔ بڑے گھروں کی بیٹیاں ہم جیسے لوگوں کے پاس آ کر انہیں سکون دیتی نہیں اُلٹا اُن سے چھین لیتی ہیں۔''

اور جب وہ آنگن میں آیا۔نسرین چائے دم کر چکی تھی۔اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''توصیف سے کہنا تھا نیچے آجاتے۔چائے تیار ہے۔''

''ساتھ کیا ملے گا؟'' آصف واش بیسن پر منہ ہاتھ دھوتا ہوا بولا۔

''پکوڑے اور شامی کباب!''

''ایک بات ہے نیناباجی''۔ وہ تولئے سے منہ صاف کرتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا؟'' نسرین مسکرا اُٹھی۔

''یہی کہ آپ جیسی سگھڑ بیویوں کے شوہر صاحبان بہت جلد موٹے ہو جاتے ہیں۔یہ بڑی بڑی توندیں نکال لیتے ہیں۔دوقدم چلنا پڑ جائے تو ہانپنے لگتے ہیں۔''

''مگر میری جیسی سگھڑ بیویوں کے اگر دیور ڈاکٹر ہیں تو انہیں یہ علم ضرور ہو گا کہ دفتروں میں کام کرنے والے شوہروں کو روزانہ کتنے کلوریز کی ضرورت ہے۔پھر بھلا پیٹ کیوں بڑھیں اور سانس کیوں پھولیں۔''

''جواب نہیں آپ کا۔'' اس نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔چائے پیئے بغیر جب وہ پورچ میں کھڑے اسکوٹر کو باہر نکالنے لگا نسرین چلائی۔

''کدھر؟ چائے تو پیتے جاتے۔میں نے پکوڑے صرف تمہارے لئے بنائے

ہیں۔''

''شکریہ۔اصل میں نینا باجی چھوٹے سے آنگن میں پام کے پودوں کے پاس نیچی تپائی پر چائے کا سامان سجائے کوئی میرے انتظار میں ہوگا۔میں نے آج چائے وہاں پینی ہے۔''

طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ نسرین کے لبوں پر بکھر گئی تھی۔ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی۔پھوپھی کا لائق بیٹا جو دیور بھی تھا،سگی ماں جائی سے دل کا معاملہ طے کئے بیٹھا تھا۔

واقعی وہ پام کے پودوں کے پاس ایزی چیئر میں دھنسی بیٹھی اس کے انتظار میں دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔چابی کو اپنے ہاتھوں میں گھماتا،سیٹی پر ایک شوخ سی دُھن بجاتا جب وہ گھر میں داخل ہوا۔وہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''لیٹ تو نہیں ہوا میں؟اور ہاں ممانی جان کہاں ہیں؟''

''پھوپھو آئی ہوئی ہیں،انہی کے ساتھ ظفر کے ہاں گئی ہیں۔''

''اوہو۔امی جان۔'' آصف نے حیرت سے کہا۔

''گھر سے تو خالہ بالی کے ہاں جانے کا کہا تھا اور پہنچ گئی ہیں یہاں۔ہماری ماں بھی کمال کی عورت ہیں۔''

اس نے چائے تیار کی۔آصف کو دی۔اپنے لئے بنائی۔

وہ پریشان سی نظر آرہی تھی۔آصف نے یہ پژمردگی محسوس کی اور بولا۔

''پینو جی کیا بات ہے؟''

''پھوپھو بڑی عجیب سی باتیں کر رہی تھیں۔''

''مثلاً۔'' آصف نے پوچھا۔

اور بڑی پھیکی سی ہنسی پروین کے ہونٹوں پر اُبھری تھی۔آصف نے کپ تپائی پر

رکھ کر بیک گرسی سے ٹکالی۔

یہ خزاں کے وہ دن تھے جب شاموں میں ایک حُسن ہونے کے ساتھ ساتھ اُداسی اور ویرانی کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ سورج کی ڈوبتی کرنیں کونے میں کُرسی پر بیٹھی پروین کے چہرے اور بالوں پر اپنے الوداعی رنگ چھوڑ رہی تھیں۔ اس کا سفید خوبصورت چہرہ اور گھنے سیاہ بال اُس سنہرے عکس سے بڑے دلفریب لگ رہے تھے۔ اس نے اپنی لانبی مخروطی اُنگلیوں سے پام کے بُوٹے کے اُوپر کی شاخ کو تار تار کر دیا تھا۔ شاید وہ اپنے سارے اضطراب کو اُسی پر آزما رہی تھی۔ اس کی چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ پلیٹ میں پڑے گرم گرم زردیاں لٹاتے پکوڑے جن کے اُبھرے اور پست کونے اُنہیں بڑی اچھی شکل دے رہے تھے۔ غالباً اب اپنی ساری حرارت کھو بیٹھے تھے۔ آصف نے جب ایک اُٹھا کر منہ میں رکھا تو اُسے وہ ذائقہ محسوس نہیں ہوا جو تھوڑی دیر قبل ہوا تھا۔

''کچھ بولو گی بھی؟''

''بھئی بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے۔ یوں بھی لائق اور ہونہار ہے۔ مل اونروں اور سیٹھوں کے ہاں سے نامہ و پیام کی باتیں آ رہی ہیں۔ بہت اُونچا اُڑنے لگی ہیں۔''

''ایسی اُڑانیں اکثر منہ کے بل گرا دیتی ہیں۔ یاد رکھنا۔''

''کسی کو یاد ہو۔ تب نا۔''

اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ پروین نے اُٹھ کر بتیاں جلائیں۔ وہ کمرے میں آ گیا۔ ڈریسنگ ٹیبل میں اُسے اپنا آپ نظر آیا۔ چلتی پھرتی پروین بھی دکھائی دی۔

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' آصف نے آواز دی۔

وہ آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اب دونوں کے عکس اس میں نظر آ رہے تھے۔ اس کے شانوں پر بکھرے بالوں کے گچھے آصف نے اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے مسلے،

اُسے دیکھا اور بولا۔

''اس چھ فٹے لڑکے کے ساتھ اگر کوئی لڑکی اچھی لگتی ہے تو وہ صرف پروین اشفاق ہے، جسے اس چوڑے چکلے سینے میں دھڑکتا دل بہت پسند کرتا ہے۔ کوئی مل اور رزوں کی باتیں کرے یا سیٹھوں کی۔ آصف احمد صرف تمہاری بات کرے گا۔''

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''واہ واہ اپنی ذات کے اظہار کا کیا نرالا طریقہ ہے؟''

''کچھ غلط ہے کیا؟'' اُس نے اس آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں بالکل نہیں۔''

کھل کر تو مخالفت نہیں کر سکتی تھیں۔ گھر میں فرمابردار اور سعادت مند بہو موجود تھی پر اشارے کنایوں سے یہ ضرور واضح کر دیا تھا کہ اُس کے مختصر سے خاندان کو رشتہ داری کے پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔ ایک آنگن میں بہت سے سمدھی آنے چاہئیں۔ رشتے ناطوں سے پرائے اپنے بن جاتے ہیں اور بوقتِ ضرورت بازوؤں کا کام دیتے ہیں۔

پہلی بار جب نسرین نے یہ سب سنا تو جیسے بنا بنایا محل اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُمنڈ آئے جنہیں بہ ہزار دقّت اُس نے بہنے سے روکا۔ اب اس مسئلے پر وہ کیا بات کرتی؟ سگی بہن کا معاملہ تھا۔ بس دم گھٹ کر رہ گئی لیکن تنہائی میں توصیف سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''پھوپھو جان کی عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ خاندان لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چلو پروین کو چھوڑ دیں مگر باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے؟''

نسرین کو تعجب ہوا۔ توصیف نے اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے کس قدر بے نیازی سے کہا۔

''دیکھو نینا وہ ماں ہے ۔اپنے بیٹے کے مستقبل کے لئے وہ ہم سب سے بہتر سوچ سکتی ہیں ۔وہ خاندان میں کریں یا باہر اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے ۔''

اور شوہر کی اس بات پر اس کے دل میں جیسے گرہ سی پڑ گئی ۔خاموشی سے اُٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی ۔سبزی کاٹتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''ہمیں اس کی شادی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے ۔'' طنز سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے ۔

وہ بھی کوئی ہمسایوں یا کسی واقف کار کا لڑکا ہے جس کی شادی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے ۔میں گھر کی بڑی بہو جو دس سال سے اِن پر اپنا تن من وارے ہوئے ہوں ۔اِن کے کانٹا چبھتا ہے تو زخم میرے ہو جاتا ہے ۔

اس کے چہرے پر یاس کے بے شمار رنگ بکھر گئے تھے جنہوں نے اس کی آنکھیں بھی دُھندلا دی تھیں ۔

خدمت گزاریوں سے کیا ملتا ہے؟ تیز طرّار اور نچانے والیاں اچھی رہتی ہیں ۔ نہ خود کو ہلکان کرتی ہیں ۔نہ اپنا من مارتی ہیں اور نہ توقعات کے چکروں میں پڑتی ہیں ۔

اور ٹھیک اُسی وقت جب آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے آصف اندر آیا تھا ۔اُس نے فوراً دوپٹے سے چہرہ صاف کیا مگر اس نے حیرانگی سے کہا۔

''آپ؟ نینا باجی رو رہی تھیں ۔''

''ارے نہیں تو ۔اصل میں اس سبزی سے آنکھوں میں پانی آ گیا ۔'' وہ زبردستی مسکرائی ۔

''مجھے مت بنائیں کاٹ آپ پالک رہی ہیں ۔''

اُس نے لاکھ کہا کہ وہ ابھی پیاز کاٹ کر ہٹی ہے اور یہ آنسوؤں کا چکر سب اسی وجہ

سے تھا،مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا اس سے سب کچھ اُگلوا کر ہی ہٹا۔

وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اون کے چولہوں پر گیس کے شعلے بھڑک رہے تھے۔چوبیس گیج کی سٹیل کی پتیلیوں میں جانے کیا پک رہا تھا؟ کبھی یہاں مٹی کے چولہے ہوتے تھے جن میں موٹی موٹی لکڑیاں جلتی تھیں۔ گیلی لکڑیاں آجاتیں تو امی جان کا پھُونکنی سے پھونکیں مار مار کر سر دُکھنے لگ جاتا۔تب یہاں چپس کا فرش نہیں تھا۔ٹیپ کی ہوئی اینٹوں کا فرش تھا جسے امی جان رگڑ رگڑ کر سرخ کیے رکھتیں۔

سردیوں میں مٹی کی ہنڈیوں میں ساگ یا شلغم پکتے۔وہ سب اکٹھے فرش پر چٹائی بچھا کر بیٹھتے اور ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش میں لڑتے اور ماں سے مار کھاتے۔روٹیاں پکا کر جب امی جان توا چولہے سے اُٹھا کر دیوار سے لگاتیں تو آصف کو اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی طرح چمکتے بے شمار شُعلے نظر آتے۔وہ سب کچھ بھول بھال کر انہیں دیکھنے لگتا۔آہستہ آہستہ وہ بجھنے لگ جاتے اور پھر بس توے کی سیاہی رہ جاتی۔کبھی کبھی امی جان ٹوکتیں۔

''تم نے کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔ پاگلوں کی طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ توے کو گھورنے لگ پڑتے ہو۔چلو روٹی کھاؤ۔ٹھنڈی ہو رہی ہے۔پھر یہ ٹھنڈی تمہارے حلق سے نہیں اُترے گی۔''

کبھی کبھی بڑے ماموں کے بچّے بھی آجاتے۔سعید بھائی،نسرین،پروین،زبیدہ باجی وہ سب بھی ان میں ٹھنس ٹھُنسا کر بیٹھ جاتے۔خوب شرارتیں ہوتیں۔آصف نے بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''تب شاید ہم اتنے مادہ پرست نہیں ہوئے تھے۔دلوں میں خلوص اور محبت تھی۔ مگر اب تو ہر کوئی ننانوے کے چکر میں اُلجھ گیا ہے۔''

ماں سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ مگر جب ریاض جانے میں چند دن رہ گئے اور ماں نے خود ہی غصے بھری آواز میں پکارا کہ میرے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔ ماں کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔ وہ آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ٹکٹ اور ویزا سے متعلق باتیں ہوئیں اور پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

''امی جان یہ مت سمجھیئے کہ یہ میری بالکل ہٹ ہے یا میں خدانخواستہ آپ کے تجربات کے لئے چیلنج بن رہا ہوں یا آپ کے مدِ مقابل آ کھڑا ہوں۔ اصل میں میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ایک ڈاکٹر کے لئے گھریلو سکون بہت ضروری ہے۔ میری ناقص رائے میں پروین جیسی سُگھڑ اور سُلجھی ہوئی لڑکی مجھے زندگی بھر سکون اور گھریلو سُکھ فراہم کر سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں جب بھی آپ میری شادی کرنے کے بارے میں سوچیں، آپ کی نظر انتخاب کا مرکز آپ کے بھائی کی بیٹی ہی ہونی چاہیے۔''

''کیوں آصف کوئی اور لڑکی جو تمہاری بیوی بنے گی تمہیں سُکھ نہیں دے گی؟ ایک بھائی کی بیٹیوں سے ہی تو مجھے اپنا ویہڑا (آنگن) نہیں بھرنا۔ تم میرے بڑے ہونہار بیٹے ہو میں تمہیں بڑی اُونچی جگہ بیاہوں گی۔ خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی لاؤں گی۔ یقیناً میرے انتخاب کو پسند کرو گے۔''

''مگر مشکل تو یہ ہے کہ میں خود انتخاب کر بیٹھا ہوں اور اس پر مطمئن بھی ہوں۔''

شاید کیا۔ یقیناً ماں بیٹے نے اُلجھ جانا تھا۔ اگر اطلاعی گھنٹی زور شور سے نہ بجتی۔ آصف اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا اور ماں نے بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''احمق کہیں کا۔ فقیر کی دھونی پر دل ہارے بیٹھا ہے۔ یہ میرا ہیرا خاک میں رُلنے والا ہے۔ بچہ ہے۔ سمجھاؤں گی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

توصیف اس سلسلے میں ماں سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر تھا۔ اپنے ملنے جلنے والوں سے

اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے ڈاکٹر بھائی کی شادی بہت اُونچی جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ایسا مطلوبہ رشتہ وہ دھیان میں رکھیں اور اُسے بتائیں۔

ریاض میں وہ ڈیڑھ ماہ رہا۔پھر اُسے آرمکو اسپتال دہران میں جگہ مل گئی اور وہ یہاں آ گیا۔دو تفصیلی خط اس نے ماں اور پروین کو لکھے۔پروین کے خط میں اُس نے لکھا تھا۔تمہاری ضرورت سے زیادہ صفائی پسندی سے میں کبھی کبھی چڑ جاتا تھا۔میری خواہش ہوتی تھی کہ کہ تم جو جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی ہو اور میں جو تھوڑے سے وقت کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں تو تم میرے پاس بیٹھ کر سکون سے باتیں کرو۔مگر یہاں مجھے تمہاری وہ نفاست پسندی اور صفائی بہت یاد آتی ہے کہ کمرہ گندہ رہتا ہے اور میں نینا باجی کا لاڈلا دیور جو اُٹھ کر گھڑے میں سے پانی بھی نہیں پی سکتا خود کو کمرے کی صفائی کرنے کے قابل نہیں کر پاتا۔فلیٹ کا تالہ کھولنے سے قبل میرا جی چاہتا ہے کہ پٹ کھلیں اور میں صاف ستھرے سلیقے سے سجے گھر میں داخل ہو جاؤں اور نازک سی ایک لڑکی اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی کھانا لگائے۔پر جب پٹ کھلتے ہیں تو جانتی ہو پینو ایسا منظر نظروں کے سامنے اُبھرتا ہے کہ میرا جی بھاگ جانے کو چاہتا ہے۔لیکن میں بھاگ نہیں پاتا۔فریج میں سے پکا پکایا کھانا نکال کر گرم کرتا ہوں اور کھا کر ہزاروں سلوٹوں والے بستر پر ڈھیر ہو جاتا ہوں۔''

ماں کو آداب و دعا کے بعد اس نے لکھا تھا۔

''امی جان آپ لوگوں نے مجھے فطرتاً بہت سہل پسند بنا دیا ہے۔یہاں پردیس میں آ کر مجھے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا ہے۔خیال تو نہیں تھا کہ میں ایک طرح منہ پھاڑ کر کبھی یہ کہوں کہ امی جان میری شادی کر دیجیے۔مگر ضرورت نے مجبور کر دیا ہے۔آپ اس پہلو پر اگر جلدی توجہ فرما لیں تو میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

ماں خط پڑھ کر بہت ہنسی تھی۔دیر تک ہنستی رہی۔بہو کو بھی آواز دے کر خط پڑھنے

کو کہا۔ وہ بھی ہنس پڑی۔

اور پھر یوں ہوا کہ ماں جوتے پہنتی، خوبصورت کپڑے زیب تن کرتی، کنگھی چوٹی اور دیگر آرائشی اشیاء سے خود کو سنوارتی اور بہو کو بتائے بغیر گھر سے نکل جاتی۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ نینا جانتی تھی کہ وہ لڑکیاں دیکھنے جاتی ہے۔ ساس سے کیا گلہ؟ شوہر بھی اس کی بہن کو اس انداز سے پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ آصف کی دلہن بنے۔

ماں بیٹے کی جدوجہد رنگ لائی تھی۔ بہت اونچے گھرانے نے آصف کو اپنا داماد بنانا منظور کر لیا تھا۔ بات کوئی چھپی رہنے والی تھوڑی تھی۔ نینا کو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ پروین نے خاموشی سے اس خبر کو سنا اور بہن سے کہا جو بھاگم بھاگ میکے آئی تھی اور اب آصف کو ڑنک کال کرنے جارہی تھی۔

''چھوڑو باجی جب اپنے اس حد تک ستم ڈھانے پر تُل جائیں تو ان سے رحم کی اپیل فضول ہے۔''

پر نینا نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور خود دروازے سے یہ کہتے ہوئے نکل گئی۔

''وہ تو میری جان کو آجائے گا۔''

اور دو دن بعد جب آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا اور اندر بڑے کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز پر بیٹھی پروین کی دعا کے لئے اُٹھی ہتھیلیوں پر اس کی بند آنکھیں ایک تسلسل سے کھارے پانی کی بارش کر رہی تھیں۔ وہ بھیگے کپڑوں کے ساتھ دروازے میں آکھڑا ہوا تھا۔ بریف کیس ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور وہ سیدھا ائیرپورٹ سے ان کے گھر آیا تھا۔

پروین نے برکھا برساتی آنکھوں سے اُسے دیکھا، یقین نہ آیا۔ بصارت کو دھوکے کا گمان ہوا تھا۔ آنکھیں صاف کیں وہ آصف ہی تو تھا۔ دل تو جیسے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

اسے سامنے پا کر اس شدت سے مچلا کہ وہ اضطراری حالت میں اُٹھ کر اُس کے سینے سے لگ گئی۔ سسکیوں سے اُس کا بدن لرزنے لگا جسے آصف نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''رونے والی کونسی بات ہے؟ دیکھو میں آ گیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اُس نے کپڑے بدلے۔ بال خشک کئے اور جب وہ چائے پینے کے لئے بیٹھا۔ پچھلے کمرے میں سوئی ممانی جاگ گئی تھی۔ ممانی کو نند کے یہ بچے بہت پیارے تھے۔ بچپن سے تو آتے جاتے تھے۔ ممتاز یوں بھی قدرے لاابالی طبیعت کی تھی۔ میکے آتی تو چھوٹے بچوں کو بھاوج کے پاس چھوڑ کر سہیلیوں سے ملنے نکل جاتی۔ صبح گئی شام کو گھر لوٹتی۔ پروین کی ماں بچوں کو اتنے لاڈ پیار سے رکھتی کہ بچے بھول کر بھی ماں کا نام نہ لیتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ پیار زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

اُس نے آصف کے بالوں پر پیار کیا۔ ماتھا چوما اور کھانے کا بندوبست کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آصف بتا رہا تھا۔ بڑا عجیب سا دن تھا۔ اُس کے لئے اُٹھنا ضروری تھا مگر کاہلی اور سُستی سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ صبح کو اُٹھتے ہوئے انسان بالعموم خود کو تر و تازہ محسوس کرتا ہے مگر اُس صبح ایسا نہیں تھا۔ سُنتیں پڑھی تھیں اور فرض پڑھنے والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پتہ چلا کہ الخوبر میں ٹیکنیکل برانچ کے انجینئر کھیم سوجو کورین تھے سائٹ پر سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ فوراً گاڑی میں بیٹھا۔ اطالوی ڈاکٹر بونسی بھی میرے ساتھ تھے۔ کھیم سو بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اُس نے دم توڑ دیا تھا۔ پردیس، اس پر ایسی دردناک موت۔ ڈیڑھ بجے گھر آیا تو بینا باجی فون پر تھیں۔ رہے سہے حواس اس خبر نے اُڑا دیئے۔ بلیک میں ٹکٹ لیا

اور یہاں آیا۔

اور دو آنسو پروین کے رُخساروں پر خاموشی سے بہہ گئے جنہیں آصف نے پُونچھا اور کچھ کہنے کی بجائے آنکھیں بند کرلیں۔

اندر اور باہر طوفان آیا ہوا تھا۔وہ کوئی دس منٹ پہلے گھر آیا تھا۔ماں بھی ٹخنوں تک پانی میں چلتی ہاتھوں میں پلندے تھامے ابھی شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔کھانے کی میز خاکی لفافوں اور ساڑھیوں کے ڈبوں سے گھری ہوئی تھی۔

باہر بادل چنگھاڑ رہے تھے اور اندر وہ پھنکارے مار رہا تھا۔ماں گرج برس رہی تھی۔

''میں نے بات پکی کرلی ہے۔زبان سے پھرنا رذیلوں کا کام ہے ہفتہ بھر میں منگنی ہونے والی ہے۔''

''کسی کی؟'' آصف کا لہجہ گستاخانہ تھا۔

''یقیناً میری نہیں تمہاری!''

''مگر منگنی میری پسند سے ہونی چاہیئے۔''

''بچے ہو۔اپنا نفع نقصان نہیں پہچانتے۔''

اس بار اس نے پاؤں زور سے فرش پر مارے۔بوٹوں سے شور پیدا ہوا۔گونجتی آواز میں وہ چلایا۔

''میں نے آپ کو بتا دیا تھا میں بچہ نہیں ہوں۔''

نسرین باورچی خانے میں سہمی کھڑی تھی۔ماں بیٹے کے سامنے آنے کی اپنے اندر ہمت نہ پا رہی تھی۔اب وہ سن رہی تھی۔ماں نے بیٹے کو چھوڑ کر گالیوں اور کوسنوں کی بوچھاڑ اس پر شروع کردی تھی۔

مسلسل پانچ روز کی محنت شاقہ کے بعد وہ ماں کو منانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ قیمتی ساڑھیاں، طلائی زیورات کا سیٹ اور اعلیٰ درجے کا کاسمیٹکس کا سامان جسے ماں نے بڑے ارمانوں سے ایک اُونچے گھر کی بیٹی کے لئے خریدا تھا اب پروین کے لئے خوانوں میں سجا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ماں کا چہرہ پژمردہ ہے۔ اس قلبی مسرت کا ہلکا سا پرتو بھی وہاں نہیں دیکھا جا رہا جو ایسے پُر مسرت موقعوں پر بالعموم ماؤں کے چہروں پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ چند ایک نے کہا بھی۔

''ارے ممتاز تو بڑی بُجھی بُجھی سی ہے جیسے ناراض ہو۔''

ایک دو نے جو صورت حال کو جانتی تھیں جواباً کہا۔

''ناراض ہی ہے۔ اُونچی جگہ ناطہ جوڑنا چاہتی تھی۔ بیٹا مانا نہیں۔ ارے بہن سچی بات ہے۔ انسان ذرا سا امیر ہو جائے تو اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ چاند جیسی بھتیجی ہے۔ بیٹے کی پسند ہے مگر اُسے غربت قبول نہیں۔''

جانے سے پہلے آصف پروین سے ملنا چاہتا تھا۔ گھر جانا اب کچھ معیوب سا تھا۔ محلے دار لوگ تھے۔ بلاوجہ حاشیہ آرائیاں اُسے پسند نہ تھیں۔ ایک سادہ سے کاغذ پر اُس نے چند لائنیں لکھ کر لفافے میں ڈال دیں۔ جگہ، تاریخ اور وقت بھی لکھ دیا اور یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ آئے ضرور۔

حسبِ توقع پروین اُسے مطلوبہ مقام پر مل گئی۔ دونوں درختوں کے ایک گھنے جھنڈ تلے آ کر بیٹھ گئے۔

پروین بہت افسردہ نظر آ رہی تھی۔ آصف نے آہستگی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور بولا۔

''تم خوش نہیں ہو کیا؟''

''اصل میں آصف مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ نئے رشتوں کی اُستواری میں پیار و محبت کی بجائے مجبوریاں آجائیں، حالات کے تحت سر جھکانے والی بات ہو جائے، اُمنگیں ختم اور جذبات سرد ہو جائیں۔ تم ہی بتاؤ انسان کو کیا محسوس ہونا ہے؟ ممتاز پھوپھو کہ ہمیشہ سے بڑی پیاری تھیں ان کے طرزِ سلوک نے دل کو زخمی کر دیا ہے۔''

''رنجیدہ نہیں ہوتے۔ یہ دنیا ہے۔ اس میں زندہ رہنے کے لئے پہاڑ جتنا دل گردہ چاہیے۔''

اگست کی دُھوپ بڑی کڑک دار تھی۔ فضا میں حبس اور گھٹن تھی۔ ہوا نام کو نہ تھی۔ آصف کی پیشانی پسینے کی ننھی ننھی بوندوں سے چمک رہی تھی۔ پروین نے ہینڈ بیگ سے صندل کے پروں والی دستی پنکھیا نکالی اور اس سے آصف کو ہوا کرنے لگی۔

''ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔'' آصف کا لہجہ ملتجی سا تھا۔

پروین کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔

''آصف میں تمہارے ایسے ملتجی سے لہجے کی عادی نہیں ہوں۔ کہو۔ حکم دو۔''

''امی جان کے خلاف اپنے دل میں کوئی بغض نہیں رکھنا۔ انہیں معاف کر دینا میری خواہش ہے تم اُن کے لئے وہی پرانی محبت محسوس کرو۔ نئے رشتے کے حوالے سے اُن کی پہچان تمہارے اور میرے لئے تکلیف کا باعث ہوگی۔''

''تمہیں ایسا کہنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ پروین گھر آگئی مگر معلوم نہیں اس کی طبیعت اس درجہ افسردہ کیوں تھی؟ باغ کے اس ویران سے گوشے میں جب وہ جانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں پروین کا جی چاہا تھا کہ وہ اُس کے سینے سے چمٹ

جائے اور دل کا سارا درد آنکھوں کے راستے نکال پھینکے۔ مگر وہ گھٹی گھٹی سی رہی اور یونہی چلتی ہوئی اپنے گھر آ گئی۔

آصف دوبارہ باہر چلا گیا۔ پھوپھو نے اس کے گھر آنا بند کر دیا تھا۔ چند بار نسرین سے اُس نے کہا بھی

''نینا باجی پھوپھو کو بھیجنا۔ دو چار دن ہمارے ہاں رہ جائیں۔''

نسرین نے یہ پیغام ساس کو دیا بھی۔ مگر وہاں بے اعتنائی اور بے رُخی تھی۔ منگنی کے بعد شب برات آئی پھر عید بھی آئی۔ میٹھی عید کے بعد عید قربان آئی۔ مگر پھوپھی کے ہاں سے اُس کے لئے ایک گز کپڑا نہ آیا۔ انہی دنوں سعید بھائی کی بڑی بیٹی نیلوفر کی منگنی آرمی میں کیپٹن خالہ زاد سے ہوئی۔ خالائیں بھانجی کے واری صدقے ہوتے نہ تھکتی تھیں۔ پروین نے یہ سب دیکھا اور دل مسوس کر رہ گئی۔ نسرین سے ذکر کیا تو اُس نے قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں آتی تو گولی مارو۔ اپنے آپ کو ہلکان کرنے سے فائدہ؟ میں دیکھ رہی ہوں۔ دن رات کی سوچوں سے تمہاری صحت گرتی جا رہی ہے۔ تمہارے ہونٹوں نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے قہقہے کہیں گم ہو گئے ہیں۔ تمہارے چاؤ، لاڈ اور ناز و ادا اُٹھانے والا سلامت رہے۔''

''نینا باجی یہ بات صحیح نہیں۔ ہر رشتہ اپنی حیثیت اور مقام رکھتا ہے۔''

''مگر بھئی مجبوری کا نام شکریہ ہے۔ جب رشتے اپنی حیثیت اور مقام بھول جائیں۔ یاد دلانے پر بھی اُنہیں کچھ یاد نہ آئے تو صبر کے سوا کیا چارہ ہے؟''

نسرین باجی کی بات ٹھیک تھی۔ پروین سرد آہ کھینچ کر خاموش ہو گئی۔ لیکن وہ روگ پال بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی پیٹ میں درد ہوتا تھا۔ بھوک کم ہو گئی تھی۔ چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

شروع شروع میں تو اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔

اب چونکی تھی۔ چیک اپ ہوا تو پتہ چلا انتڑیوں کا کینسر ہے جو پھیل گیا ہے۔

ماں نے سینہ پیٹ لیا۔ بھائی بہنوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے فوارے پھوٹ پڑے۔ جہیز کے لئے باپ نے جو روپیہ رکھا ہوا تھا اس سے علاج شروع ہوا۔ پیسہ ختم ہوتا گیا اور ساتھ ساتھ اُس کی زندگی بھی گھٹتی گئی۔ تین ماہ میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی مگر پھوپھی نہ آئی۔

اور جس دن گھر کے سب افراد زار زار روتے ہوئے دعائیں مانگ رہے تھے کہ اے اللہ اس چھوٹی سی جان پر درد و کرب کا جو عذاب نازل ہو گیا ہے اسے اس سے نجات دے۔ پھوپھی آئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ پروین کے بستر کے قریب گئی۔ وہ جان کنی کے عالم میں تھی لیکن حواس ابھی قائم تھے نظر پڑتے ہی رُخ پھیر لیا اور رو لی۔

''اسی بات کی منتظر تھیں شاید۔ جیت گئی ہیں آپ۔ مبارک ہو۔''

اور آدھ گھنٹے بعد وہ دم توڑ گئی۔ حشر کا سا سماں تھا۔ ایسی جوانی کی موت۔ ہر آنکھ آنسوؤں کی یورش میں تھی۔ چہلم تک نسرین ماں کے گھر رہی اور پھر اپنے گھر لوٹ آئی۔ گھر آنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ ساس اور شوہر کے طرزِ عمل سے وہ سخت دلبرداشتہ تھی۔ مگر کیا کرتی۔ تین بچوں کی ماں کا کہیں ٹھکانہ بھی تو نہ تھا۔ باپ کون سا صاحبِ جائیداد تھا کہ اُس کی دولت کے بل بوتے پر اس کے دروازے پر بیٹھی رہتی۔ ساس پاس بیٹھی۔ اپنی صفائی میں بُہت کچھ کہتی رہی۔ نسرین چپ بیٹھی سنتی رہی۔ حقیقت پر پردہ ڈالنے سے حاصل۔ وہ اپنی ساس کو بہن کا قاتل سمجھتی تھی۔ اس ساس پر، اس گھر پر اس نے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ صلہ کیا ملا؟ یہ سب۔

اور جب اُٹھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''نسرین آصف کو کچھ مت لکھنا۔وہ پردیس میں ہے سن کر پریشان ہوگا۔''

نسرین نے طنزیہ ہنکارہ بھرا اور ساس کے پاس سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''میں اتنی کم ظرف نہیں۔اطمینان رکھیے۔میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

سال بعد جب آصف چھٹی پر آیا۔ڈھیر سارا سامان لایا تھا۔آنگن میں اٹیچی کیس اور بند ڈبے بکھرے پڑے تھے۔کمرے میں وہ سب چائے پینے بیٹھے۔نسرین نے کپ آصف کو تھمایا جب اُس نے سوال کیا۔

''نینا باجی ممانی جان کو میرے آنے کی اطلاع نہیں دی۔وہ کیوں نہیں آئیں؟''

نسرین تو ابھی کوئی جواب نہ دے سکی ساتھ والے گھر کی ہمسائی مبارک باد دینے کے لئے آئی بیٹھی تھی وہ شاید موقع کی منتظر ہی تھی۔فوراً بولی۔

''ارے بچے جب سے جوان بیٹی کی فوتیدگی کا داغ لگا ہے سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔اس بے چاری نے کیا آنا تھا؟''

چائے کا کپ آصف کے ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر کر چور چور ہوگیا۔

''کون سی بیٹی؟ نینا باجی یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اُس کا چہرہ پل بھر میں سفید پڑ گیا۔

''حوصلہ رکھو آصف۔'' توصیف نے اُس کے کندھے تھپتھپائے۔

نسرین کی ہچکیاں نکل گئیں اور پروین کا نام سُن کر تو جیسے اُسے سکتہ سا ہوگیا۔ توصیف ماں کا اشارہ پا کر اُسے بیڈروم میں لے گیا۔وہ لیٹنے کو لیٹ گیا مگر اُسے کسی پل قرار نہ تھا۔نسرین دیر بعد جب اُس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آئی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔نسرین کے چہرے کو اُس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ کو مجھے اطلاع دینی چاہیئے تھی۔وہ تین ماہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا

رہی اور آپ مجھے دو لائنیں بھی نہ لکھ سکیں۔ میں اسے باہر لے جاتا آپ نے میرے ساتھ ظلم کیا۔ نینا باجی بہت ظلم کیا۔"

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ روتا رہا۔ نسرین اُسے گلے سے لگائے اُس کے سر کو تھپتھپاتی رہی۔

وطن آنے کی ساری خوشی ختم ہوگئی تھی۔ زندگی ایک ایسا گراں بوجھ محسوس ہونے لگا تھا جسے اُٹھانے کے لئے اُسے اپنے کندھوں کی کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ صبحوں کی دلکشی ختم ہوگئی اور شاموں کا حُسن ماند پڑ گیا۔ ہر سو گھمبیر ویرانی اور سناٹا تھا۔ وہ ماں سے ناراض تھا۔ نسرین سے ناراض تھا۔ توصیف سے بات نہیں کرتا تھا۔

چھٹی تو ڈیڑھ ماہ کی تھی۔ مگر پندرہ دن بعد واپس چلا گیا۔ ڈہران سے ہی وہ امریکہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ اُس کا کینسر میں ریسرچ کرنے کا ارادہ تھا۔

چھ ماہ بعد اُس نے گھر خط لکھا تھا۔ پھر گاہے بگاہے خط آنے لگے۔ تین سال بعد وہ وطن واپس آگیا۔ اس کا پروگرام پاکستان میں ہی پریکٹس کرنے کا تھا۔

اب ماں کبھی کبھی اُسے شادی کا کہنے لگی تھی۔ نسرین بھی اصرار کر رہی تھی۔ توصیف بھی اسے بیاہنے کا بڑا آرزو مند تھا۔ بس سب کے اصرار پر وہ خاموش رہا۔ اس کی پسند کے بارے میں ماں اور بھائی نے نہ دریافت کیا اور نہ ہی خود اس نے کچھ بتانا مناسب خیال کیا۔ اس سارے ہنگامے میں جو خالصتاً اس کی ذات اور اس کے مستقبل سے متعلق تھا۔ اس کا کردار ایک خاموش تماشائی کا سا تھا۔ اس بار پہلے سے بھی اُونچا گھر دیکھا گیا۔

دھوم دھڑکے سے شادی ہوئی۔ کار اور کوٹھی جہیز میں آئی۔ گھر تنگ محسوس ہوا۔ توصیف نے کوٹھی میں چلے جانے کا مشورہ دیا اور غالباً پہلی بار اُس نے زبان کھولی۔

"ہم یہیں رہیں گے۔ اس گھر کی دیواروں میں مجھے اپنائیت کا احساس ملتا ہے۔

یہ ماحول مجھے سکون دیتا ہے۔''

اونچے گھر کی بیٹی نک چڑھی سی لگتی تھی۔ابھی تو خیر ابتدائی دن تھے مگر ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے مصداق آنے والے حالات کی کچھ سُن گُن کا اندازہ ہوتا تھا۔

گزشتہ دو دنوں سے اس کی گاڑی توصیف لے جا رہا تھا۔آج صبح ماں کو کہیں جانا تھا۔اس نے توصیف سے کہا کہ وہ اُسے چھوڑ آئے۔

ماں تیار ہو کر آنگنائی میں کھڑی ہوئی۔آصف کُرسی پر بیٹھا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ توصیف اپنے کمرے سے تیار ہو کر نیچے آیا اور باہر نکلنے ہی والا تھا۔جب نئی نویلی دلہن رات کی نائٹی میں دھم دھم کرتی نیچے اُتری اور تیز آواز میں توصیف سے مخاطب ہوئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے آپ ہر روز گاڑی لے جاتے ہیں۔اتنا ہی گاڑی کا شوق تھا تو اپنی خریدنی تھی یا سُسرال سے لینی تھی۔پرائی گاڑیوں پر عیش کرتے پھرتے ہو''۔

نسرین زینے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔آصف نے اخبار پر سے نگاہیں اُٹھا کر بیوی کو دیکھا اور دوبارہ خبریں پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ماں ہونقوں کی طرح کھڑی تھی اور توصیف غصے سے سُرخ ہو گیا تھا۔

''آصف!'' وہ چلایا۔اسے سمجھاؤ میں کون ہوں؟ اچھے گھروں کی بہو بیٹیوں کو ایسی زبان استعمال کرنی چاہیئے؟''

ماں بھی بولی۔

''آصف اتنا سر پر چڑھا لیا تو تنگ ہو جاؤ گے۔''

اور آصف اخبار چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ماں اور بھائی کو دیکھا اور طنز سے بھرپور لہجے میں بولا۔

''امی جان اور توصیف بھائی آپ تو بڑی جلدی گھبرا گئے ہیں۔ابھی تو بسم اللہ

ہوئی ہے۔ ابھی تو عشق کی ابتدا ہے۔ انتہا نہیں دیکھیں گے؟‘‘

سادھو اور سواد

عجیب مصیبت کھڑی کر دی تھی اُس چلبلے، نٹ کھٹ شیطان چھوکرے نے۔ ماش کی دال کے آٹے کی طرح اکڑ گیا تھا۔ وہ اُس کی بھاوج تھی۔ رشتے کی نزاکت کھل کر ڈانٹ ڈپٹ میں مانع تھی۔ کہیں ماں ہوتی تو گدّی سے پکڑ کر ایسے زوردار جھٹکے دیتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ ساری شوخی اُڑنچھو ہو جاتی۔ پر اُسے سبق سکھانے کی بجائے وہ تو اُس وقت خود سبق پڑھ رہی تھی۔ اپنا خون جلا جلا کر پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

سب گھر والے اُس وقت بڑے کمرے میں جمع تھے۔ وہ اپنے چھوٹے دیور کے لئے لڑکی دیکھ کر آئی تھی۔ لڑکی کے بارے میں ساری تفصیل اُس نے افرادِ خانہ کے گوش گذار کر دی تھی۔ لڑکی اُسے بہت پسند آئی تھی۔ نازک سی، کلیوں جیسی معصوم اور خوبصورت۔

اپنے شوہر اور دیور کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یقین مانیئے۔ گلاب کا تازہ کھلا ہوا پھول ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہوگی اگر ہم اس پھول کو اپنے گھر کی زینت بنالیں۔''

اُس کی آنکھوں میں تیرتی پھرتی چمک، لہجے میں چھلکتا اشتیاق اور وفورِ مسرت سے دمکتا اُس کا چہرہ سب اُس کی اندرونی کیفیات کے عکاس تھے۔

اُس کے سُسر اُٹھ گئے تھے ۔مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔کمرے میں اب صرف وہ دیورانیاں اُن کے میاں اور بچے رہ گئے تھے ۔وہ بھی اُٹھنے ہی والی تھی جب نعیم نے کہا۔

''آپی یہ غلط بات ہے ۔شادی آپ میری کرنا چاہتی ہیں اور لڑکی آپ پسند کر رہی ہیں ۔یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟ مجھے لڑکی دکھایئے ۔''

اُس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ جس نے اُسے تلملا کر رکھ دیا۔

''لو اور سنو میں کیسے دکھاؤں؟ پردے دار گھرانہ ہے۔''

''آپ سے تصویر لانے کے لئے کہا تھا۔آپ وہ بھی نہیں لائیں ۔''

''میں کیا اُن کے بکسوں سے نکال کر لے آتی ۔زبانی کلامی بہتیرا کہا سنا۔اُنہوں نے عذر پیش کیا کہ کوئی اچھی تصویر اس وقت نہیں ہے ۔یوں بھی لڑکی کی ماں نے کہا کہ دیکھو ابھی کوئی بات تو پکی ہوئی نہیں یوں ہی بچی کی تصویر گھومتی پھرے اچھا نہیں لگتا۔''

نعیم نے مزے سے تڑتڑ اُس پر اعتراضات کی بوچھاڑ سی کر دی۔

''یہ آپ مجھے کن جاہل، اَن پڑھ اور بنیا دپرستوں کے پلّے باندھنے لگی ہیں۔ دین کے احکامات کا تو اُنہیں شعور ہی نہیں ۔''

وہ سر سے لے کر پیر تک سُلگ اُٹھی ۔

''تم ایسے ہی مین میخ نکالتے رہے تو شادی ہو چکی تمہاری۔ جب ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں کہ تم اپنی پسند کی لڑکی لے آو۔اس پر بھی تم رضامند نہیں۔ ہماری پسند پر بھی تمہیں اعتبار نہیں تو پھر اب جاؤ بھاڑ میں۔'' اُس کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔

''پسند کی لڑکی لانے کا مطلب سمجھتی ہیں آپ ۔پہلے کوئی لڑکی پسند آئے پھر میں اس سے یاری دوستی گانٹھنے کے لئے اُس کے پیچھے خجل ہوں ۔روگ پالوں ۔پھر وہ سرے

چڑھے یا پنچ میں ہی تڑاخ سے ٹوٹ جائے۔اُوپر سے آپ لوگوں کے اعتراضات کہ ہمیں کیا اپنی مرضی سے ذلیل ہو رہا ہے۔بھگتے خود ہی۔نہ بابا نہ۔میں نے تو بندوق آپ لوگوں کے کندھوں پر رکھ کر چلائی ہے۔"

"تمہاری مثال تو اس شخص کی سی ہے جو اپنے لئے اس دنیا میں لاجواب سی لڑکی پسند کرنا چاہتا تھا۔ہر ایک میں نقص نکالنا اس کی فطرت بن گئی تھی۔یار احباب بُہت تنگ آ گئے۔بالآخر ایک چندے آفتاب چندے مہتاب لڑکی دکھائی گئی۔اس بار خوش قسمتی سے وہ اس کی کسی بات میں کوئی خامی نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔دوست بیلی خوشی سے پھولے نہ سمائے۔مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔لڑکی نے لڑکے کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔خوب بن سنور کر گیا۔خوش گپیوں میں وقت کٹا۔پر اگلے دن اُس نے شادی سے انکار کر دیا۔ دوستوں نے پوچھا اب کیا ہوا ہے؟ اُس نے غمگین سی صورت بنا کر کہا۔ارے احمقو میں نے اپنی ہونے والی حسین بیوی کا تیس سال بعد کا رُوپ اپنی ساس کی صورت میں دیکھ لیا ہے۔ بھئی مجھے تو اُس کا یہ رُوپ قبول نہیں۔

اُس کی اس کہانی پر سب ہنس پڑے۔چھوٹی دیورانی بولی۔

"بالکل ٹھیک کہتی ہیں آپ۔اِس نے معاملہ یوں ہی لٹکائے رکھنا ہے۔"

"تو بھئی ہمارا کیا حرج ہوگا؟ نقصان تو یہی اُٹھائے گا۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ لیٹ گئی۔کہنے کو تو وہ حرج اور نفع نقصان دونوں اس کے کھاتے میں ڈال آئی تھی مگر حرج بھی اُس کا تھا اور نقصان بھی۔کہنے کو دیور تھا۔شوہر کا بھائی پر پیٹ کے رشتوں سے کم نہ تھا۔بُہت پیارا، دُلارا، محبت کرنے اور دینے والا۔

لڑکی کیا اُسے تو گھر گھرانہ بھی بُہت پسند آیا تھا۔کہیں اگر کچھ محسوس ہوا تو بس اُن

کی تھوڑی سی قدامت پسندی تھی۔ پیسے کے اعتبار سے، حُسن واخلاق کے ناطےاور سادگی کے حوالے سے سبھوں میں ''لاجواب ہیں۔'' جیسی بات تھی۔ پڑھے لکھےاور باشعور بھی تھے۔ بیٹے، بہوئیں، بیٹیاں، داماد سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، بڑوں کے فرمابردار اور کہنے کارقسم کے لوگ تھے۔ اب وہ اُس کی ان الٹی پلٹی باتوں سے پریشان بھی تھی۔ اتنی ڈھیر ساری چیزیں اکٹھی مل رہی تھیں جو بالعموم نہیں ملا کرتیں۔ اب اگر اُس نے کوئی پھڈا ڈال دیا تو؟

وہ تو لڑکی پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ آج کے زمانے میں بھرے پُرے خاندان میں مل جل کر رہنے والی لڑکی کامل جانا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ وہ گھرانہ اورلڑکی ایسی ہی تھی۔ اب وہ سوچ سوچ کر ہی پریشان ہورہی تھی۔

ایک پھڈا وہ پہلے بھی ڈال چکا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے گیا اور تعلقات الگ خراب ہوئے۔ یہ گوجرانوالہ کی کھاتی پیتی پڑھی لکھی فیملی تھی۔ ان کی اپنی برادری بھی تھی۔ لڑکی کا باپ اور اُس کا سُسر آرمی میں تھے۔ ملتان اور بہاول اکٹھے رہے مگر یہ تب کی بات تھی جب بچے چھوٹے تھے۔ نعیم تو کافی چھوٹا تھا۔ اُس کے سُسر لاہور تبدیل ہوکر آگئے اور ریٹائرمنٹ تک لاہور ہی رہے۔ بعد میں گھر بھی یہیں خرید لیا مگر دوست کی زمانوں کوئی خبر نہ ملی۔

عجیب سی بات تھی۔ زمانوں بعد دونوں دوستوں کا حجام کی دوکان پر ٹکراؤ ہوا۔ گلے ملے پرانی باتیں دہرائیں۔ وہیں دُکان میں کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے انہیں وقت کا تو ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو ماضی میں تھے اور حال کہیں پرے تھا۔ مگر جب دُکاندار نے مؤدبانہ گزارش کی۔

''صاحب گاہکی بڑھ رہی ہے اور جگہ تنگ ہے۔ آپ بزرگ ہیں۔ محسوس نہ کریں۔''

تو دونوں ''اوہ بھئی'' ہمیں تو خیال ہی نہیں رہا معاف کرنا۔'' کہتے کہتے اُٹھ گئے اور گھر آ ئے ۔ وہ اس وقت لان میں کھڑی مالی سے نئے موسمی پودے لگانے کے بارے میں بات کرتی تھی۔

''ارے بھئی یہ ہماری بڑی بہو ہیں۔'' اُنھوں نے ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

اُس نے فوراً ہی انتہائی مؤدب انداز میں اُنہیں سلام کیا۔ دُعا لی اور جب دونوں لان میں ہی دھری کُرسیوں پر بیٹھ گئے تو پوچھنے گئی کہ وہ ٹھنڈا لیں گے یا گرم۔

سہ پہر تک وہ گھر میں ہی رہے۔ سب لڑکے دفتروں سے آ گئے تھے۔ نعیم ان دنوں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ وہ بھی ڈیڑھ بجے پہنچ گیا تھا۔ کھانا سارا خاندان اکٹھا ہی کھاتا تھا۔ وہ بُہت خوش ہوئے۔ گوجرانوالہ آنے کی سب کو دعوت دی۔ اس کے سُسر اور اُس نے اصرار کیا کہ وہ رات رہیں۔ مگر وہ ہنستے ہوئے بار بار یہی کہتے رہے۔

''بھئی کیسا بھا گوان دن تھا۔ پُرانے یار سے ملاقات ہوئی۔ دراصل میں تو یہاں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا۔ وہ اپنی آبائی زمین بیچنا چاہ رہا ہے۔ گاؤں میں ہمارے چونکہ بنّے (حدیں) سانجھے ہیں۔ اس لئے میرا ارادہ اُسے خریدنے کا تھا۔ پر وہ تو ملا نہیں۔ یہاں سے گذرتے ہوئے اِس باربر کی دُکان نظر آئی تو بُہت کچھ یاد آ گیا۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوران میں اُس کا مستقل گاہک تھا۔ اب سوچا چلو خط ہی بنوا لوں اور وہاں ملاقات ہو گئی اپنے یار سے۔''

اور دونوں دوست ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پھر زور سے ہنسے۔

پندرہ دن میں کوئی چار بار ٹیلی فون آیا اور ہر بار بُہت اصرار سے اُنہیں آنے کی

دعوت دی گئی ۔اس کے سُسر نے ایک دن کہا۔

''بھئی نعیمہ اور بچے چکر لگا آئیں ۔''

اور وہ جو اس وقت گھر کے سب لوگوں کو چائے دینے میں مصروف تھی فوراً بولی۔

''آپ ساتھ چلئے تبھی مزہ آئے گا۔''

اور وہیں بیٹھے بیٹھے اگلے دن گوجرانوالہ جانے کا پروگرام بن گیا۔

سٹیلائٹ ٹاؤن میں بڑا عمدہ گھر تھا۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شادی شدہ تھے اور سب گوجرانوالہ میں ہی مقیم تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بیاہنے والے تھے۔ چھوٹی اور آخری بیاہنے والی بیٹی بڑی من موہنی سی تھی وہ تو دیکھتے ہی لٹو ہوگئی۔ میاں کو اس نے اشارہ کیا کہ وہ بھی غور سے دیکھ لے۔ راستے میں اُس نے سُسر سے کہا۔

''ارے بھئی میں نے کیا پسند کرنی ہے؟ تمہیں اچھی لگی تو ٹھیک ہے۔ لوگ دیکھے بھالے ہیں۔ بس مسز حمید ذرا تیز عورت ہے اور حمید صاحب تو اللہ کا نام لینے والے ہیں۔''

اُس نے گھر آ کر لڑکی کے خوب گُن گائے۔ اگلے ہفتے دونوں چھوٹے دیور اور ان کی بیویاں اُسے دیکھنے گئیں۔ واپسی پر انہوں نے بھی جی کھول کر تعریف کی مگر نعیم نے سب کو ٹھنڈا کر دیا یہ کہتے ہوئے۔

''بھئی لڑکی دکھایئے پہلے۔ بنا دیکھے میں نے شادی نہیں کرنی۔ اُس کی ساس زندہ نہیں تھی۔ بڑے بیٹے کی بیوی ہونے کے ناطے گھر میں اُس کی مرکزی حیثیت تھی۔ طبعاً وہ ذمہ دار اور فرض شناس تھی۔

ابھی وہ اس پہلو پر ممکنات کا جائزہ لے رہے تھے کہ خود ہی ایک موقع فراہم ہو جانے والی بات ہوگئی۔ لڑکی کا چچا کینیڈا سے کوئی پندرہ برس بعد آ رہا تھا۔ سارا خاندان اسے لینے ائیرپورٹ آیا۔ دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے انہوں نے ان کے ہاں پی۔ نعیم

نے لڑکی دیکھی ۔شرارت سے مسکرایا۔نعیمہ نے پوچھا تو بولا۔

''بسم اللہ کیجیے حضور۔آپ کا انتخاب مابدولت کو پسند آیا۔''

اور وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''تو پھر ہو جائے بات پکی۔''

''ہو جائے جی ہو جائے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے دایاں ہاتھ فضا میں لہرا دیا۔

بات پکی ہوگئی۔

بلکہ شادی وادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔

کوئی بیس دن باقی تھے بیاہ میں، جب لڑکی کی ماں زیورات کے سلسلے میں لاہور آئی۔شام کو وہ نعیم کے ساتھ ہی بازار گئی۔گھر سے جاتے ہوئے نعیم بہت خوش و خُرّم تھا۔چہکتے ہوئے ساس کو لے کر گیا تھا مگر جب واپس آیا تو بڑا بُجھا بُجھا سا تھا۔گاڑی سے اُترتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔نعیمہ باہر لان میں ہی بیٹھی تھی۔اس کی ہونے والی ساس کو اپنے ساتھ ہی لان میں لے آئی۔اس نے سوچا شاید تھک گیا ہے مگر جب وہ گھر جانے کے لئے رخصت ہونے لگی تب بھی وہ کمرے سے نہ نکلا۔اُلٹا وہ خود اُس کے کمرے میں گئی۔

''میرا خیال ہے تھک گیا ہے۔آنکھ لگی ہوئی ہے۔''

نعیمہ بھی ساتھ تھی اور اُسے اچھی طرح علم تھا کہ وہ سویا ہوا ہرگز نہیں۔ابھی کوئی پندرہ منٹ پہلے تو وہ اس کو چائے دے کر آئی تھی۔اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر وہ بولی تھی۔

''ارے کیا ہوا تمہیں؟ تم بھی بس برسات کا موسم بن گئے ہو، پل میں ہنستے مسکراتے اور پل میں تھوبڑا پھلائے۔''

اور وہ بس کو نگے کا گڑ کھائے بیٹھا رہا۔اس نے کہا بھی۔

''تم باہر آ جاتے تمہاری ساس جانے والی ہے۔''

''بی آپا پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔رات کے کھانے پر بات ہوگی۔''

اور اُس نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔پر وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

رات کے کھانے پر بم پھٹا۔اُس نے بیٹھتے ہی کہہ دیا کہ وہ وہاں کسی قیمت پر بھی شادی نہیں کرے گا۔

''کیوں؟'' سب کی زبانوں سے بے اختیار نکلا۔

''لڑکی کی ماں انتہائی چالاک عورت ہے۔سارے گھر کا شیرازہ بکھیر دے گی۔تم لوگوں میں (اُس نے نعیمہ کی طرف اشارہ کیا) کیڑے ڈال گئی ہے۔وہ اپنی بیٹی کو الگ رکھنا چاہے گی اور بھلا میں آپ لوگوں سے الگ ہو سکتا ہوں؟ ارے میں اس جان لیوا جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گا۔''

اور پھر اُس نے ساری گفتگو جو اس کے اور اس کی ہونے والی ساس کے درمیان ہوئی تھی سب کے گوش گزار کر دی۔آخر میں اُس نے کہا۔

''آپ لوگ خود ہی گفتگو کے ان ٹکڑوں سے اندازہ لگائیں وہ کس قماش کی عورت ہے اور کیا چاہتی ہے؟''

یوں منگنی ٹوٹ گئی اور شادی ہونے سے رہ گئی۔اب پورے تین سال بعد وہی مسئلہ پھر آن کھڑا ہوا تھا۔

اس بار عزیزوں میں بات چلی تھی مگر یہ ایسے عزیز تھے جن کا ان کے ہاں آنا جانا برائے نام تھا۔مذہبی اور پردے دار گھرانہ تھا۔لہذا لڑکی کو دیکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔بڑی مصیبت نعیمہ کے لئے تھی جو لڑکی والوں کو کچھ آس بھی دلا آئی تھی۔

چند دن گھر میں بڑی خاموشی رہی۔ہر کسی نے اس موضوع پر بات چیت سے

گریز کیا۔نعیم بھی ان دنوں کسی میڈیکل ریلیف یونٹ کے ساتھ آزاد کشمیر گیا ہوا تھا۔ہفتے بعد واپس آیا۔بڑا چپ چاپ سا تھا۔بچوں کے لئے چیزیں ویزیں بھی نہیں تھیں۔کھل کھل کر کے ہنسا بھی نہیں۔بس چپ چاپ آ کر سو گیا اور شام کو ڈیوٹی پر چلا گیا۔تین دن ایسے ہی گزر گئے۔چوتھے دن وہ خود اس کے کمرے میں گئی۔

''کیا بات ہے؟ آج کل تم آسمانوں پر رہتے ہو۔ایک نظر زمین کے باسیوں پر بھی ڈال لو کہ وہ کس حال میں ہیں؟''

اور وہ قدرے مسکرا کر بولا۔

''خوش و خرّم ہیں۔حال احوال سب اچھا ہے۔اپنے اپنے بچوں میں مست ہیں۔پُوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ آنکھیں سب دیکھتی ہیں۔'' اور نعیمہ نے طنز سے کہا۔

''تو تمہیں دُکھ ہے کہ ہم اپنے اپنے بچوں کے ساتھ مست ہیں۔بھئی میں تمہیں بھی مست دیکھنا چاہتی ہوں۔اب اگر تم پلہ نہ پکڑاؤ تو بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپی۔'' نعیم دفعتاً سنجیدہ ہو گیا تھا۔

ماں تو خدا نے چھین لی۔بہن کی نعمت سے پیدائشی محرومی ہے۔خدا کا احسان ہے کہ آپ جیسی بھاوج ملی جس نے اِن دونوں رشتوں کا بھرم رکھا۔میں نے محسوس کیا ہے آپ کولڑکی بہت پسند آئی ہے۔خاندان بھی اچھا لگا ہے۔آپ میری مزاج آشنا بھی ہیں۔ظاہر ہے کوئی ایسا فیصلہ جو میرے لئے بہتر نہ ہو آپ کیسے کر سکتی ہیں؟ بس تو میں سارا معاملہ آپ پر چھوڑتا ہوں اور آپ کو اختیار دیتا ہوں۔

اُس کی اِس درجہ جذباتی گفتگو نے نعیمہ کو بھی مغموم سا کر دیا تھا۔

''یقین کرنا نعیم تم میرے انتخاب کو سراہو گے۔''

''بس تو آپی آپ کا جو جی چاہتا ہے کیجیے۔''

''نعیم تم میری آنکھوں اور میری پسند پر اعتبار کر لو گے۔''

''ارے آپی کر تو رہا ہوں۔اب کیا اسٹام لکھوانا چاہتی ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔سچ کہہ رہے ہو۔ایک تو تمہارے موڈ سے بھی ڈر لگتا ہے۔''

''بائی گاڈ! میں سب کچھ آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔''

اُس نے اُس کے پھیلے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

چلیئے بات کسی رُخ ڈھب پر تو چڑھی۔نعیمہ نے لڑکی والوں کو فون کر کے اپنا مدّ عا اُن کے گوش گذار کرتے ہوئے کہا کہ وہ آ کر لڑکے کو دیکھ لیں۔پر لڑکی کی ماں نے سادگی سے یہ کہتے ہوئے کہ میرے دونوں بیٹوں نے ڈاکٹر کو دیکھا ہوا ہے۔اِس لئے اُنہیں تو اِس بردکھوے چکر میں قطعی نہیں پڑنا۔

لیجیے نعیمہ کے دل کی مراد پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔لڑکی پسند تھی اور بہت ہی پسند تھی۔لڑکا بھی او کے ہو گیا تھا۔

نعیمہ چاہتی تھی کہ دیورانیاں بھی ایک نظر دیکھ لیں اور منگنی نکاح کے معاملات بھی طے کر لیں۔اطلاع دی گئی اور ایک دن تینوں تیار ہوئیں اور لڑکی کے گھر جا پہنچیں۔ڈیڑھ سو کلومیٹر کا سفر تھا۔کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئیں۔

چار بجے اُٹھیں۔بے حد کشادہ لان میں چائے پی گئی۔لان کی گھاس دبیز اور خوبصورت تھی۔اطراف میں کھِلے گلابوں اور رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کے حاشیوں کے ساتھ کسی دل کش قالین کا تاثر اُبھرتا تھا۔بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔نعیمہ مسکرائی اور زور زور سے سانس لیتے ہوئے ڈھیر ساری خوشبو اپنے اندر جذب کی

اور بولی۔

''آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے پر لان کی خوبصورتی نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔''

لڑکی کی ماں اور بڑی بہن ہنسیں۔

''بس میری ضد تھی کہ گھر میں نے چار کنال سے کم رقبے پر نہیں بنانا۔ مجھے یہ بات کبھی زیب تو نہیں دیتی پر وہ جو کہتے ہیں رہت ملوک کہ ذات۔ شروع سے ہی بڑے گھروں میں رہی تو عادت ہی خراب ہوگئی۔ چھوٹے گھر میں تو دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔''

نعیمہ نے جب اصل مطلب پر زبان کھولی تو لڑکی کی ماں نے کہا۔

''بی بی ہمیں بھلا تم سے عزیز کون ہو سکتا ہے؟ پرانی باڑھ کو نیا چھاپا لگے گا۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں کو میل ملاپ کم رہا مگر رشتہ داری کی اپنی خوشبو ہے۔''

اور واقعی نعیمہ نے سوچا۔ بھلا انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ وجیہہ ڈاکٹر لڑکا، شریف لوگ، آج کے زمانے میں تو شادی بیاہ بھی کاروبار بن گئے ہیں۔

''نعیمہ میری فوزیہ بڑی بخت والی ہے۔''

فوزیہ کی ماں نے اپنی روایتی سادگی سے نعیمہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ نعیمہ بھی اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔

پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

نعیمہ کی آنکھوں میں بھی ''عجیب واقعے'' کا سُنتے ہی تجسّس کی لہریں ناچنے لگی تھیں اور وہ تفصیلات جاننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

یہی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ آٹا ختم ہو رہا تھا۔ گندم کی چھان پھٹک کے بعد نوکروں نے بوریاں تو دو دن پہلے سے تیار کر رکھی تھیں۔ میں انہیں کہہ رہی تھی کہ وہ

آٹا پسوا لائیں۔ گھر میں چٹکی بھر آٹا نہیں رہے گا تب جائیں گے۔ انور جب بوری اُٹھا کر باہر نکلا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں اسے تاکید کردوں کہ وہ پسائی کے وقت پاس رہے اور یہی کہنے کے لئے میں بیرونی گیٹ کی طرف بھاگی۔ نعیمہ تم یقین کرو گی وہاں ایک بوڑھا فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ عالمِ استغراق میں یوں جیسے کوئی مجذوب ہو۔ اس کے ہاتھوں پر جا بجا چٹاخ تھے۔ اس کا چہرہ ایسا نورانی سا تھا کہ نظر ہٹانی مشکل تھی۔ جذب کے عالم میں معلوم ہوتا تھا۔ میں ایک ٹک اُسے دیکھتی رہی۔ اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں سمجھی وہ بھوکا ہے۔ میں اُسے اندر لے آئی۔ چارپائی پر بٹھایا۔ فوزیہ، میمونہ اور شیری تینوں وہاں آگئیں۔ اُس نے سب کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فوزیہ بولی۔ ''بابا جی تھکے ہوئے لگتے ہیں۔ لیٹ جائیں۔'' اور وہ لیٹ گئے۔ آنکھیں بند تھیں۔ شیری شربت بنا کر لائی۔ گلاس اُن کے ہاتھوں میں تھمایا۔ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اُنہوں نے گلاس خالی کیا۔ زوردار آواز میں شکر الحمدُ للہ کہا۔ زیرِلب آیات کا ورد کرتے ہوئے پھونکوں کو فضا میں اُچھالا۔ گلاس ابھی تک اُن کے ہاتھوں میں تھا اور نعیمہ میں تو حیرت زدہ رہ گئی جب اُنہوں نے خالی گلاس مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بیٹی میمونہ کے دس سال سے بچہ نہیں ہوا۔''

میں نے ہاتھ جوڑے اور بولی۔

''سائیں بابا بُہت علاج کروائے۔ آپریشن بھی کروایا۔ پر اللہ کو منظور نہیں ابھی۔''،''نہیں رب بھلی کرے گا۔ اُس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ مانگو تہہ دل سے مانگو۔ نوازے گا وہ۔''

اور میرا دل جیسے اس بات پر ایمان لے آیا کہ ہمارے گھر میں اتفاق سے کوئی پہنچا ہوا بزرگ آگیا ہے۔ میں نے کہا۔

''سائیں بابا آپ خاص دُعا کریں میری بیٹی کے لئے۔''

اُن کی داڑھی پر اُن کے لعاب دہن کے چھینٹے سے پڑے جب اُنہوں نے کہا۔

''فاطمہ بیگم تم اللہ کی رحمت سے مایوس ہو۔ مایوسی گناہ ہے، کفر ہے۔ استغفار پڑھو۔''

اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ توبہ استغفار پڑھا۔ سچی بات ہے میں گُنگ ہوگئی تھی۔ میرا نام اُنہیں معلوم تھا۔ وہ واقعی کوئی برگزیدہ شخصیت تھے۔ میں نے شیری سے فوراً کہا کہ وہ دروازہ بند کر دے۔ نوکروں کو منع کیا کہ وہ باہر کوئی بات نہ کریں۔ دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ مفت میں ہجوم اکٹھا ہو جائے اور میں اُن کی خصوصی توجہ سے محروم ہو جاؤں۔ میں نے فوزیہ کو ان کے پاس بٹھایا اور اُس کے بارے میں پوچھا۔

اُنہوں نے خود ہی کہا۔ ''اِس کی کہیں بات چل رہی ہے؟''

میں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھی جگہ ہے۔ اللہ کا نام لے کر کر دو۔ لڑکا بُہت لائق اور اچھا ہے۔''

پھر اُنہوں نے کہا۔

''بچی کو میرے پاس تنہا چھوڑ دو۔ میں اِس پر دم کر دوں۔ اُس کی آئندہ زندگی خوشگوار ہو۔''

میں نے اُن کی ہدایت پر عمل کیا اور کمرے میں فوزیہ کو اُن کے پاس چھوڑ دیا۔

پندرہ بیس منٹ تک وہ اس سے باتیں کرتے رہے پھر وہ آکر مجھے اُن کے پاس لے گئی۔

''نعیمہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میرے گھر میں خدا اُتر آیا ہے۔ رحمتیں نازل ہوگئی ہیں۔ برکت اُتر آئی ہے۔ ہم سب اُن کے واری صدقے ہو رہے تھے۔

ابھی گھنٹہ بھر نہ ہوا تھا کہ باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے کھولا تو ویسے

ہی حلیے کا ایک اور درویش کھڑا تھا۔

''لو بی بی ہمارے ساتھی آ گئے ہیں ۔ چلتے ہیں ۔'' اندر آؤ۔ اُنہوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

''دُعا دو بچوں کو۔'' اُنہوں نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

اور اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر ہمارے لئے دعائیں کیں ۔بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرے ۔فوزیہ کو خصوصی پیار دیا بلکہ پہلے درویش نے اُس کے بالوں پر بھی پیار کیا۔

حیرت زدہ سی بیٹھی نعیمہ سُنتی رہی ۔قدسیہ بولی تھی ۔''اللہ ایسے پہنچے ہوئے بزرگ کہیں ہمارے گھر بھی آ جائیں ۔''

نعیمہ نے فوزیہ سے پوچھا کہ سائیں بابا نے اُس سے تنہائی میں کیا باتیں کیں تو وہ بولی۔

''باجی اُنہوں نے منع کیا تھا۔'' ماں بھی بیٹی کی ہم خیال معلوم ہوتی تھی کہ کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہیے وگرنہ اثر زائل ہو جاتا ہے ۔نعیمہ کو اُن کی ضعیف الاعتقادی پر حیرت ہوئی۔ اتنے مذہبی سے لوگ تھے ۔پر ایسے معاملات میں عام لوگوں کی طرح نرے جاہل۔

پھر منگنی اور شادی سے متعلقہ مسائل پر بات چیت ہوئی ۔

نعیمہ نکاح کے لئے مُصر تھی ۔خاتون خانہ نے کہا ۔چلو اِس پر ہم بات چیت کر کے اطلاع کریں گے۔

اور جب وہ واپس آ رہی تھیں نعیمہ نے فرح سے کہا۔

''فرح یہ سائیں بابا والا چکر مجھے نعیم کی کارستانی لگتی ہے ۔میرا دل کہتا ہے کہ یہ وہی بدمعاش ہے۔''

''ارے توبہ کریں آپی۔کسی کے گھر میں یوں جایا جاسکتا ہے؟''

''تم اُسے کیا سمجھتی ہو؟ وہ ڈرامیٹک کلب کا صدر رہا ہے۔ایسے ہیر پھیر کسب کرتا رہا ہے کوئی اور نہیں ہوگا اُس کے سوا۔دیکھ لینا۔میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔''

گھر میں داخل ہوئیں تو اتفاقاً پہلا ٹکراؤ نعیم سے ہی ہوا۔وہ گھر پر تھا اور گیٹ اس نے ہی کھولا تھا۔گاڑی سے اُترتے ہی وہ بولی۔

''ہو تم پورے بدمعاش۔جو بھانڈا پھوٹ جاتا تو مار مار کر بھرتا بنا دیتے تمہارا۔ اور سارے خاندان برادری میں الگ نشر کرتے۔''

اُس نے اپنے دائیں پر بایاں ہاتھ مارا۔کھل کھل کر کے ہنسا اور بولا۔

''تو سن آئی ہیں سائیں بابا کی داستان۔''

''لو دیکھ لو۔وہ فرح کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔تمہیں شک تھا میں جو کہہ رہی تھی۔''لو بھلا ایسے پہنچے ہوئے بزرگوں کو تاکا جھانکی کی ضرورت ہے اور وہ بھی فوزیہ کے گھر۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ ذرا تم نے فوزیہ سے تنہائی میں کیا باتیں کیں؟''

''جو ہمارا جی چاہا کیں۔آپ کون ہوتی ہیں پوچھنے والی؟''

''ابھی میں بہت کچھ ہوں۔یاد رکھنا تیرے کچے چٹھے کھولنے پر قادر ہوں۔''

اُس نے آنکھیں گھمائیں اور شرارت سے اُسے گھورا۔

''بھئی راز کی باتیں مت پوچھئے نا۔''

''ویسے یہ تمہیں سوجھی کیا۔نعیمہ سنجیدگی سے بولی۔

''بھئی اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔اب آپ لوگ بھی تعاون نہیں کر رہی تھیں۔ یوں بھی میں نے خلاف شرع تو کوئی کام نہیں کیا۔حدیث نبوی ہے کہ لڑکے کو دکھا کر شادی

کی جائے۔'' وہ ہنسے جا رہا تھا۔

''دیکھو ذرا اس ڈھیٹ کو، ریفرنس کوڈ کر رہا ہے مذہب کا اور یہ بھی مذہب میں لکھا ہے کہ جوان جہان لڑکی کے بالوں کو چومتے پھرو۔''

''ارے آپی اللہ قسم اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ رہا ہی نہ گیا۔ سادھو اور مجذوب تو بنے ہی تھے اور آپ تو جانتی ہیں۔ سادھاں نوں کی سوداں نال۔۔۔ ہنے ملائی آن دیو۔

جنون تیر اساری کا

ایسی رسیلی اور لوچ دار آواز تھی کہ وہ جو قطاروں کے درمیان کھڑا مہمانوں کے سامنے زردے پلاؤ کی پلیٹیں رکھ رہا تھا، چونک کر کھڑا ہو گیا اور اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ کھلے دروازے میں سے آنگن میں کھڑی بیٹھی عورتوں اور لڑکیوں کا جمگھٹا ضرور نظر آ رہا تھا، مگر گانے والی کونسی ہے یہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ آواز تھی کہ کلیجہ چیرتی جاتی تھی۔

اُس نے پھرتی سے اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہا اور چھلانگ لگا کر ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا چھت پر چڑھ گیا۔ پھر منڈیر پر دونوں کہنیاں ٹکا کر نیچے انگنائی میں دیکھا۔ گہرے سبز کپڑوں والی ایک لڑکی ڈھولک پر چمچ بجا رہی تھی۔ بھاری بھر کم پکی عمر کی عورت بڑے مستانہ انداز میں ڈھولک تھپک رہی تھی اور نوعمر لڑکیوں کے عین درمیان کاہی رنگ کے سوٹ میں بائیس تیئس سال کی لڑکی تالی بجاتے ہوئے گا رہی تھی۔ اس کے نین نقش تیکھے اور رنگ گندم گوں تھا۔ اُسے اگر حسین نہیں کہا جا سکتا تھا تو بدشکل بھی نہ تھی مگر آواز تو سچ مچ جادو تھی۔

وہ اچھی اور خوبصورت آوازوں کا دلدادہ تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی کی سب اچھی گانے والیوں کا وہ مدّاح تھا۔

ایک گیت ختم کرنے کے بعد اب وہ دوسرا شروع کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ

آواز اگر ریڈیو ٹی وی پر آجائے تو تہلکہ مچ جائے۔

وہ کافی دیر سے اسی کشش و پیچ میں گرفتار تھا۔ گانے والی کی آواز اُس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ کو کسی کے آجانے اور لڑکیوں کو دیکھنے کا ملزم گردانے جانے کا ڈر بھی اُسے بوکھلائے دے رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر تار پر میلے کپڑوں میں سے ایک ڈوپٹہ کھینچا اُس سے سر اور آدھا چہرہ چھپایا اور قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ نیچے دیکھنے لگا۔

یہ اُس کی بہن کی شادی تھی اور ابھی گھنٹہ بھر پہلے اُس کی سسرال سے لڑکیوں کا ایک جتھہ مہندی لے کر آیا تھا۔ وہ سوچنے لگا: ''یہ لڑکی یقیناً اُنہی میں سے ایک ہوگی۔''

لڑکی کا تنقیدی جائزہ لے کر اُس نے اندازہ لگایا کہ وہ بس اُن کی ہی کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ کپڑے بھڑکیلے اور مصنوعی زیورات سے سجی ہوئی تھی۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے بھی وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہا اور جب وہ زینے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ رہا تھا اُس کے دماغ میں دفعتاً خیال آیا کہ اگر میری شادی اس لڑکی سے ہو جائے تو میرا مستقبل یقیناً تابناک ہو سکتا ہے۔ اُس کے جاننے والوں میں کئی ایسے تھے جو محض بیویوں کی وجہ سے چمک گئے تھے۔

اُس کا تعلق سوسائٹی کی اس کلاس سے تھا جس میں کھانے والے زیادہ اور کمانے والے کم ہوتے ہیں۔ دس کے کنبے میں پہلے صرف باپ کمانے والا تھا۔ تھوڑی سی اُس کی تنخواہ اوپر سے اخراجات کی بھرمار بس کھینچا تانی والی بات تھی۔ لیکن دو سال پہلے وہ باپ کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

اس خاندان میں چار لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک خدا خدا کر کے باپ کی دہلیز چھوڑ رہی تھی۔ بقیہ تین کا بوجھ سر پر تھا۔ تین بھائی مختلف جماعتوں میں پڑھ رہے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہو گیا۔ جہاں رات گئے تک کام کرنا

پڑتا تھا پھر کسی واقف کار کی مدد سے اُسے ریڈیو سٹیشن میں ملازمت مل گئی ۔ یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا تھوڑا کام اور پیسے زیادہ۔کئی بار اُس نے سوچا تھا کاش میری آواز اچھی ہوتی یا اداکاری سے کوئی لگاؤ ہوتا !مگر یہ دونوں باتیں اس کے بس کا روگ نہ تھیں ۔

اور اب ایک اچھی آواز سن کر وہ ایک ایسی زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا جس میں آسائش کی جھلک تھی ۔

وہ یقیناً اُس کی بہن کی سسرال سے تھی۔اگلے روز وہ بارات کے ساتھ آئی اور ولیمے والے دن بھی اُس نے اُسے اندر باہر کام کرتے دیکھا۔

بہن سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ اُس کے ماموں سسر کی بیٹی ہے اور ابھی اُس کی منگنی ونگنی بھی نہیں ہوئی ۔بہن مسکرا پڑی اور بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی تھی ۔

''پسند ہے؟ کہو تو بات کروں ۔''

''ضرور۔''جواباً وہ بھی ہنس دیا تھا۔

بہن شاید مذاق ہی سمجھی تھی مگر جب اُس نے سنجیدگی سے کہا تو بولی ۔

''سوچ سمجھ لو کافی غریب لوگ ہیں۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔تم بات پکی کرنے کی کوشش کرو۔''اُس نے کہا۔

اُس کی ماں کو پتہ چلا تو اس نے مخالفت کی۔وہ کسی اچھے گھر بیٹے کو بیاہنا چاہتی تھی کہ گھر سامان سے بھر جائے مگر بیٹے نے ایک نہ سنی ۔پیغام بھجوایا گیا اور وہ بغیر کسی ردو کد کے منظور کر لیا گیا۔لڑکی کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اور کوئی اچھا رشتہ نہیں آ رہا تھا۔ایسے میں رشتے داروں ہی کا ایک کماؤ لڑکا ملا تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

کچھ ہی دن بعد شادیانے بجے۔ وہ گھوڑے پر چڑھا اور خوبصورت آواز والی لڑکی کو اپنے گھر لے آیا۔

سہاگ رات کو اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا۔ بغور دیکھا وہ دل کش نظر آ رہی تھی۔ اُس وقت گھر والے اور مہمان سب تھک کر سو چکے تھے۔ برآمدہ، آنگن اور بڑا کمرہ سب تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُس نے آہستگی سے دُلہن کا بازو پکڑا اور بولا۔

''آؤ باہر چلیں۔ چاندرات ہے۔''

دُلہن نے حیرت سے اسے دیکھا اور حکم کی تعمیل میں جوتے پہننے لگی۔ وہ اُسے نزدیکی پارک میں لے آیا۔ سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچ پر جب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تو اُس نے ہر سو چھٹکی چاندنی میں اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''کوئی اچھا سا گیت سناؤ گی۔''

''گیت!'' وہ ہکلائی۔

''ہاں ہاں گیت!'' اُس نے اطمینان سے کہا۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے تمہاری آواز سنی اور وہ مجھے اتنی بھاگئی کہ میں نے سوچا صرف یہی لڑکی میری زندگی کی ساتھی ہوگی۔''

''تو تمہیں میری آواز اچھی لگی۔ میں نہیں!'' دُلہن نے کہا۔

اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُس کے لہجے میں کرب کی آمیزش سی ہے۔

''بھئی آواز بھی تمہاری ہی ہے۔ اسے تمہاری شخصیت سے جُدا تو نہیں کیا جاسکتا۔''

دُلہن گانے لگی اور سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک رس بھری آواز اُبھری جیسے باغ میں جابجا ایستادہ سرو کے بوٹوں، خوش رنگ کھلے پھولوں اور گاہے بگاہے ایک دوسرے کو دیکھتے

ہوئے میاں بیوی نے سنا اور سُنایا۔

وہ اب اکثر اُسے باہر لے آتا اور اُس سے گیت سُنتا۔ اُسے اُمید نہیں یقین تھا کہ ایک بار اگر یہ آواز مائک اور سکرین کے ذریعے فضا میں گونج گئی تو اُس کا مقدر رتا بناک ہو جائے گا۔ اُسے والدین اور سسرال والوں کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا مگر اُس کا فیصلہ تھا کہ اس سلسلے میں کسی کی پرواہ نہیں کرے گا۔ یوں ابھی تو اُسے اپنی بیوی کو بھی ہموار کرنا تھا۔ وہ نماز روزے اور پردے کی خاصی پابند تھی۔ کسی عزیز رشتے دار کے ہاں جاتے ہوئے اُس نے اُسے برقع نہ پہننے کے متعلق کہا تو اُس نے جھجکتے ہوئے دور بیٹھی ساس کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اسے پسند نہیں کریں گی۔ وہ بولا۔

''اُن کی تم فکر نہ کرو۔''

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولی۔

''اصل میں مجھے برقعے کے بغیر باہر نکلنے کی عادت نہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں پہننا شروع کر دیا تھا نا۔''

عادت کا اک دم بدلنا واقعی مشکل ہوتا ہے لیکن اُس نے اصرار جاری رکھا۔ اب اُٹھتے بیٹھتے اُسے اُن عورتوں کے بارے میں بتاتا جو اپنے شوہروں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور گھر کی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور پھر یونہی ایک دن اُس نے وہ بات کہہ دی جسے وہ عرصے سے کہنا چاہتا تھا۔

''تمہیں قدرت نے ایسی اچھی آواز دی ہے۔ کیا تمہیں اس سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیے؟''

یہ جاننے پر کہ وہ اُسے ریڈیو اسٹیشن لے جانا چاہتا تھا کہ وہ وہاں گائے۔ اُس نے جھرجھری لی اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''میں اتنے لوگوں کے سامنے کیسے گا سکوں گی؟ مجھے تو عجیب لگ رہا ہے۔شرم آتی ہے۔''

''شادی بیاہ پر گاتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں۔''

وہ شرم پر زور دیتے ہوئے بولا۔

اُس نے شوہر کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کیا تو بولی۔

''وہ دوسری بات ہے وہاں تو سب عورتیں ہوتی ہیں۔''

''بہت خوب دل کی تشفی کے لئے یہ تاویل اچھی ہے وگرنہ بند کمرے سے نکل کر یہ آواز چاہے دنیا بھر کے لوگ سنیں۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا بازو بنوں۔گھر کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں مدد کروں۔دیکھو تم نٹنگ مشین لادو۔مجھے سویٹر بننے آتے ہیں۔میں یہ کام کروں گی۔''

''کام ہی کرنا ہے تو اچھا کرو نا کہ محنت کم اور پیسہ زیادہ ملے۔قدرت نے تمہیں ایک خوبی دی ہے کیوں نہ دنیا اس خوبی کو جانے۔''

وہ کتنے دن شوہر کے اس مطالبے کو رد کرتی رہی لیکن بالآخر مان گئی۔ایک دن گھبراتے، ڈرتے اور جھجکتے وہ اُس کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوگئی۔

چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تین مردوں کے سامنے اُس نے گیت گایا تو اُس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی اور ہونٹ سفید پڑ گئے، مگر شوہر کے خوف سے وہ گاتی چلی گئی۔

بند کمرے سے نکل کر جب یہ آواز فضا میں پھیلی تو ٹیلیفون پر ٹیلیفون کھڑکے۔ خطوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ریڈیو اسٹیشن کے پروگراموں کے معاہدے بڑھتے گئے اور اُس کے شوہر کی جیب چیکوں سے بھرتی چلی گئی۔

پھل اور گوشت پہلے کبھی آتے تھے۔اب کھانا ان کے بغیر نامکمل سمجھا جانے لگا۔
تن کے کپڑے اُجلے ہو گئے۔گھر میں آرائش کی چیزوں کا اضافہ بھی ہوا۔
شروع شروع میں ساس سسر نے مخالفت کی۔مگر گھر میں گھُسی فراغت نے منہ بند کر دیئے۔وہی بہو جسے لانے پر ساس نے ناک بھوں چڑھائی تھی اب آنکھوں کا تارا بن گئی۔

شروع میں اس بات کو چھپایا گیا،مگر یہ ایسی بات نہ تھی جسے زیادہ دیر تک چھپایا جا سکتا۔جب وہ بن سنور کر چھوٹے دیور کے ساتھ گھر سے نکلتی تو گھروں کی دہلیزوں میں بیٹھ کر باتیں کرنے والی عورتیں ضرور پوچھتیں کہ دُلہن کہاں جا رہی ہے؟
وہ ذرا مسکرا کر کبھی ماں کا اور کبھی کسی رشتے دار کا نام لیتی۔لیکن مایا ہمسایوں کو تجسس میں ڈال رہی تھی کہ ایکا ایکی ان کی حالت کیسے بدلنے لگی؟ ساس دروازے پر کھڑی ہو کر بہتیرے حیلے بہانے کرتی مگر ان کی نگاہوں سے چھلکتے تجسس کے سامنے ساری تاویلیں بے کار تھیں۔
آواز جادو بھری ہو اور صرف ریڈیو تک محدود رہے یہ کیسے ممکن تھا۔ٹی وی اور فلم سے پیش کش ہوئی۔اس پیش کش نے گھر میں کچھ اُلجھن سی پیدا کر دی۔اب تک سلسلہ چوری چھپے جاری تھا اور ٹی وی پر آنے کا مطلب تھا کہ اب تک جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سب غلط تھا۔شوہر نے تذبذب کی یہ کیفیت دیکھی تو دو ٹوک لہجے میں بولا۔
''غریب تھے کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔کھانے لگے ہیں تو لوگوں نے جلنا شروع کر دیا ہے۔ہمیں کسی کی پرواہ نہیں۔''
اور یوں اُس کے لئے ٹی وی کی راہ ہموار ہو گئی۔
اب وہ جدید وضع کے بہترین لباس پہنتی۔بالوں کے نت نئے ڈیزائن بناتی۔

خوش حالی سے صورت پر نکھار آ گیا تھا اور وہ دیکھنے میں خاصی خوبصورت نظر آنے لگی تھی مگر ان سب کے باوجود ابھی احساس کمتری میں مبتلا تھی اور اس کی وجہ اُس کا ان پڑھ ہونا تھا۔ پڑھی لکھی خواتین اور لڑکیوں کے سامنے گونگی بنی بیٹھی رہتی۔ شوہر سٹوڈیو میں یوں اس کے آگے پیچھے پھرتا جیسے کوئی ادنیٰ خادم ہو۔ ایک تو شکل وصورت واجبی اُوپر سے ہر وقت مسکینی طاری۔ پیسے کا پُجاری ایسا کہ کیا مجال ایک دھیلا بھی ادھر اُدھر ہو۔ اُس کی اس عادت سے بھی اُسے نفرت تھی۔

ایک روز اُس نے پڑھنے کے لئے ٹیوٹر رکھنے کی ضد کی تو وہ بولا۔

''ایسی فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے؟ نوکری کرو گی کہیں؟''

''نوکری تو نہ کروں گی مگر ادب آداب تو سیکھوں گی۔ چار لوگوں میں بیٹھ کر شرمندہ تو نہ ہوں گی۔''

''بڑی ہوشیار ہوتی جا رہی ہو۔''

شوہر نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''جس جہنم میں تم نے مجھے دھکیل دیا ہے وہ ہوشیاری کا تقاضا کرتا ہے۔ بُدھو بنے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اگر یہ جہنم ہے تو دفع کرواسے!'' شوہر نے کہا۔

''اب اس سے نکلنا آسان نہیں۔ زندگی کا یہ رُخ میں نے کب دیکھا تھا؟'' اُس نے خوابناک سی آواز میں کہا۔

یہ حقیقت تھی کہ یہاں آ کر اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ جانوروں جیسی زندگی گزارتی رہی ہے۔ اُونچے اُونچے لوگوں سے میل ملاپ بے حد اسمارٹ اور خوبصورت سا کوئی مرد ذرا سا سر جھکا کر جب اُسے تعظیم دیتا اور اُس کی آواز کی تعریف کرتا تو اُس وقت خود آگہی کے

ایسے جذبے سے سرشار ہوتی جو اس سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔اب اُسے اپنے حریص شوہر سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن جب وہ لمبے کوریڈور میں کھڑی کچھ لوگوں سے باتیں کر رہی تھی وہ آ پہنچا تعارف کروایا گیا تو اُن میں سے ایک نے بڑی آہستگی سے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ پچھو سا تمہارا شوہر ہے؟ کیا دیکھا تمہارے والدین نے۔''

وہ تو کٹ کے رہ گئی۔سارا وقت اُس کے ذہن سے یہی جملہ چمٹا رہا۔گھر آ کر وہ شوہر سے خوب لڑی۔

رفتہ رفتہ وہ سارے چیک خود وصول کرنے لگی اور بینک میں اپنا ذاتی حساب کھول لیا۔

ایک ماہ بعد اُس نے تھوڑی سی رقم شوہر کو دینی چاہی تو وہ تلملا اُٹھا۔وہ بھی بھری بیٹھی تھی تنک کر بولی۔

''محنت میں کروں اور گلچھرے تم اور تمہارا خاندان اُڑائے۔یہ نہیں ہوگا کان کھول کر سُن لو اب اپنے سارے معاملات میں خود طے کیا کروں گی۔''

دونوں میں خوب لڑائی ہوئی اور اُس دن کے بعد گویا جھگڑا اس گھر کا مقدر بن گیا۔اُس کا جی جب چاہتا بن سنور کر اکیلی گھر سے نکل جاتی اور شوہر کو پلنگ پر بیٹھے گُوھتے دیکھ کر اُسے بہت لُطف آتا۔وہ اس سے پوچھتا۔

''کہاں سے آرہی ہو؟''

وہ جواباً کہتی۔

''ذرا کمانے گئی تھی۔''

دونوں خوب خوب لڑتے۔غلیظ گالیوں سے ایک دوسرے کی تواضع کرتے۔اکثر

ہاتھا پائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی ۔

ساس عقلمند تھی ۔حالات کو بگڑتے دیکھ کر دونوں کو سمجھاتی اور وقتی طور پر معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

اُنہی دنوں اُس کا ملاپ اپنی سہیلی کے بھائی سے ہوا جو انگلینڈ سے آیا تھا اور اُس کا بڑا پرستار تھا۔اُس کے پاس اُس کے تمام گانوں کے ریکارڈ تھے جو وہ اب تک گا چکی تھی۔ اُس نے اُسے یوں شیشے میں اُتارا کہ وہ جو رات کو گھر چلی جاتی تھی اب گھر جانا بھی ختم ہو گیا۔

میکے والے دین دار قسم کے لوگ تھے۔گانے بجانے کو فن کے طور پر نہیں بلکہ مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اسی لئے ناپسند کرتے تھے۔بیٹی کو ٹی وی پر گاتے دیکھا تو اُس سے ملنا چھوڑ دیا۔

روز روز کے لڑائی جھگڑوں نے محلے کی عورتوں کے لئے گویا ایک موضوع پیدا کر دیا تھا۔ جہاں چار عورتیں مل بیٹھتیں یہی ذکر شروع ہو جاتا اور جب وہ گھر ہی سے چلی گئی تو گویا طوفان ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شوہر کا ذہنی سکون اُڑ گیا تھا۔ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔چوتھے دن وہ اُسے ڈھونڈنے نکلا۔نازلی کے گھر پہنچ کر اُس کے بارے میں دریافت کیا تو نوکر اُسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔تھوڑی دیر بعد وہ آئی ۔بناؤ سنگھار تو وہ پہلے بھی بہت کرتی تھی مگر آج تو حلیہ ہی کچھ اور تھا۔بال کٹے ہوئے اور بلاؤز بہت اونچا اور بغیر آستین کے۔اُس نے جب اُسے گھر چلنے کے لئے کہا تو وہ بے نیازی سے بولی۔

''کس گھر؟ تمہارے گھر سے میرا کوئی ناطہ نہیں ۔''

''ضد چھوڑ دو ۔سب لوگ پریشان ہیں۔'' شوہر خوشامدیں کرنے لگا۔

''پریشان!'' اُس کے ہونٹوں پر زہریلی ہنسی اُبھری۔

''شاید اس لئے کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے اُڑ گئی۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم میری بیوی ہو میں تمہیں بیاہ کر لایا ہوں۔''

''بیاہ تم نے مجھ سے نہیں، میری آواز سے کیا تھا۔ بیوی سمجھ کر نہیں نقد چیک جان کر لائے تھے۔ میں تمہیں خوب سمجھتی ہوں۔''

''تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا؟'' شوہر نے گویا دھمکی دی۔

وہ بولی۔

''مجھے جب اس کی ضرورت ہو گی، عدالت سے لے لوں گی۔ گھبراؤ نہیں۔''

شوہر بے نیل و مراد واپس آیا۔ بار بار سوچتا۔ اس چُپڑی روٹی سے وہ سوکھی اچھی نہ تھی جو سکون سے مل رہی تھی۔ عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔

اُس دن سے وہ نازلی کے بھائی کے ساتھ ہر جگہ جانے لگی تھی۔ شوہر کو ڈوب مرنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ یار لوگ ایسے ایسے ٹھٹھے اُڑاتے کہ پانی پانی ہو جاتا۔

ایک دن آصف میر نے جب یہ کہا کہ میری بیوی ایسا کرتی تو میں اُس کو یا اپنے آپ کو گولی سے اُڑا ڈالتا۔ تو یہ بات اُس کے دل کو لگی۔ بدنامی مقدر بن گئی تھی۔ کہیں اور دفع ہو جاتی تو بات بھی تھی وہ تو سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ وہ گُم سُم سا ہو کر کئی دن سوچتا رہا۔ آخر ایک صبح اخبارات میں خبر چھپی۔

معروف گلوکارہ قتل کر دی گئی۔ پولیس تفتیش میں مصروف ہے۔ ملنے جلنے والوں نے اظہارِ افسوس بھی کیا اور ٹھٹھے بھی اُڑائے۔ وہ ڈیوٹی سے غائب تھا۔ دوست کنٹین میں بیٹھے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ساتھ اس خبر پر خوب خوب تبصرہ کر رہے تھے۔

ایک نے کہا۔

’’بھئی اب جورو کی کمائی کھانی اتنی آسان بھی نہیں۔‘‘